© rasailojaraid.com

رنگِ خیال

الحمدللہ کہ ہم مسلمان اور ایک آزاد مملکت کے شہری ہیں، جسے اسلامی جمہوریہ پاکستان کہا جاتا ہے۔ یہ پاکستان دو قومی نظریہ کی اساس پر قائم ہوا ہے۔ یہ دو قومی نظریہ کیا ہے؟ اسلامی نظریہ کا غیر اسلامی نظریہ سے تشخص اور امتیاز۔ سوئے نصیب کہ پاکستان بننے کے بعد ہم نے بحیثیت مجموعی اس نظریہ کو فراموش کر دیا۔ نتیجتاً پاکستان اپنے مقصدِ تخلیق سے ہم آہنگ نہ ہو سکا یعنی وہی سماجی عدم تحفظ، وہی معاشی عدم استحکام، وہی سیاسی عدم سالمیت، تعلیم و صحت کے باب میں وہی ناہمواریاں اور اپنے دین کی اساس یعنی قرآن و سنت سے وہی عدم تعلق، وہی دوریاں، وہی مجبوریاں کہ جس کی وجہ سے پاکستانی معاشرہ آج تک اسلامی معاشرہ نہ بن سکا۔ اس سلسلے میں بغرض اصلاح ہر دور میں کچھ نہ کچھ کوششیں ضرور ہوتی رہی ہیں اور یہ انہی کوششوں کا ثمر ہے کہ ابھی اندھیرا نہیں چھایا۔ چراغ سے چراغ جل رہے ہیں۔ امید کی کرن آج بھی روشن ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ یہ نورانی اقلیت کبھی اکثریت نہ بن سکی بلکہ غیر اسلامی ثقافتی یلغار اور جلوؤں کی ہمہ ہمی میں خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ مبادا یہ اقلیت، اقلِ قلیل میں تبدیل ہو جائے۔ (خدا نہ کرے کہ یہ روزِ بد بھی ہمیں دیکھنا نصیب ہو) ایسی صورتحال میں ہر درد مند اور حساس مسلمان، بے چین اور مضطرب دکھائی دیتا ہے مگر رستہ نظر نہیں آتا۔ ایسے میں ملت کے نوجوانوں کو صحیح رستہ دکھانا اگر معلموں اور دانشوروں کا کام نہیں تو پھر کس کا کام ہے؟

چنانچہ جامعہ کراچی کے حساس طلبہ اور اساتذہ و دیگر اہلِ علم و اربابِ دانش نے باہمی مشاورت کے بعد گذشتہ سال سے "التفسیر" کے نام سے ایک سہ ماہی علمی، فکری اور تحقیقی مجلہ نکالنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس مجلہ کا مقصد ملت کے نوجوانوں کو قرآن مجید اور سنتِ نبوی ﷺ کی طرف واپس لانا ہے، ان کے زاویہ فکر و نظر کو ٹھیک کرنا ہے، انہیں علمی منہاج مہیا کرنا ہے، انہیں تحقیق و تدقیق کی راہوں پر ڈالنا ہے تاکہ وہ غیر ضروری مسائل میں نہ الجھیں، فروعات سے بچیں، فکر و عمل میں وحدت اور قرآن و سنت کی مرکزیت پیدا کریں، جدید علوم و فنون سے آراستہ ہوں، اقصائے عالم پر اپنے "خیر امت" ہونے کی شہادت دیں۔ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کے "یہ کام بہت بڑا ہے اور ہماری کوششیں ضعیف، ایک پہاڑ کو کاٹ کر جوئے شیر نکالنی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں نہ قوت ہے، نہ ہمارے تیشے میں دھار، پھر بھی اگر توفیقِ الٰہی شامل ہوئی تو ہم کامیاب ہوں گے، ورنہ کم از کم ایک عظیم مقصد میں اپنے دست و بازو کو شل کرنے کی سعادت سے بہرہ مند ہوں گے۔"

ہم اپنے حصے کا کام کر رہے ہیں، آپ اپنے حصے کا کام کیجئے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس علمی و دینی کام میں آپ اپنے باوقار ادارے، کمپنی، انڈسٹری، فیکٹری کا اشتہار دے کر ہماری مالی معاونت اور سرپرستی فرمائیں تاکہ جس کارِ خیر کا آغاز ہم نے بے سروسامانی کے عالم میں کیا ہے، وہ مسلسل جاری و ساری رہے اور ہم سب کے لئے صدقہ جاریہ بن جائے۔

(مدیر اعلیٰ)

عذابِ الٰہی اور فطری حوادث کے مابین فرق و امتیاز

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج
استاذ الفقہ والتفسیر
شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

پاکستان میں 8 اکتوبر 2005ء کو برپا ہونے والے زلزلے نے ایکبار پھر یہ ابدو الابد حقیقت واشگاف کر دی ہے کہ تمام تر طاقت اور وسائل و ذرائع کے باوجود، انسان قدرت کے آگے بالکل بے بس ہے۔ انسانی بے بسی کی یہ تعبیر، عذابِ الٰہی سے بھی کی جاتی ہے اور ان فطری قوانین کی رو سے بھی جن کا ظہور، بہرحال ناگزیر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ نیچرل پروسس ہوتا ہے جسے علت و معلول کی دنیا میں بہرحال اپنے منطقی انجام تک پہنچنا ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ یہ طبیعی حوادث اندھے ہوتے ہیں، جو بغیر کسی امتیاز کے اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ انسانوں کی بہترین اور اعلیٰ اخلاقیات اپنی قدر و منزلت کے باوجود انہیں ان حادثوں سے نہیں بچا سکتیں۔ تاہم بہترین اور اعلیٰ طبیعی اسباب و ذرائع انہیں کسی نہ کسی حد تک ضرور بچا سکتے ہیں۔

عذابِ الٰہی اور حوادثِ ارضی و سماوی کے مابین فرق و امتیاز کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے عذابِ الٰہی کے مفہوم کو سمجھ لیا جائے۔ دراصل جب ہم حوادثِ زمانہ کے مقابلہ پر عذابِ الٰہی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں وہ مفہومِ عذاب مرتسم ہوتا ہے جو گذشتہ اقوام پر ان کی نافرمانیوں، سرکشیوں اور ظلم و تعدی کی پاداش میں وارد ہوتا رہا ہے۔ گو وہ عذاب، کسی نہ کسی حادثہ ارضی و سماوی کی شکل میں ہی کیوں نہ آیا ہو۔ مگر ان کا سررشتہ بہرحال انسانی اعمال سے جڑا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ حادثات فقط قوانینِ فطرت کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ انسانی اعمال کا نتیجہ تھے۔

جبکہ سائنسی زبان میں عذابِ الٰہی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حوادثِ ارضی و سماوی کی سائنسی توجیہ کرنے والے لوگ عذاب ہائے ماسبق کو بھی طبیعی حوادث قرار دیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خارجی کائنات کے طبعی حوادث ہی ان اقوام کی تباہی کا موجب بنے ہیں نہ کہ ان کی بداعمالیاں۔ یوں ان حادثوں کا انسان کی اخلاقی اقدار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس مکتبِ فکر کے نزدیک ان حوادث کے ذریعے ان اقوام کی تباہی میں اگر کوئی "مافوق الفطرت" عنصر ہوتا ہے تو فقط اتنا کہ رسولوں کو آنے والے حادثات کا علم قبل از وقت دے دیا جاتا ہے اور اس طرح وہ اپنی اور اپنی جماعت کی حفاظت کا مناسب انتظام کرلیا کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک "مافوق الفطرت" عنصر کا اعتراف بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ اقوامِ گذشتہ کی بربادی بالکلیہ فطری قوانین کے تابع نہیں، بلکہ فطرت سے مافوق کسی اور ہستی کے تابع ہے اور ظاہر ہے کہ فطرت سے مافوق وہی ہوسکتا ہے، جو خود خالقِ فطرت ہے۔ پھر یہ کہ فطرت سے مافوق ذریعہ کو جب کسی ایک امر میں تسلیم کیا جاسکتا ہے تو دوسرے میں کیوں نہیں تسلیم کیا جاسکتا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر طبعی حادثہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی عذاب (تکلیف دہ چیز) اپنے دامن میں ضرور رکھتا ہے۔ بایں سبب ہر حادثہ کو فقط "عذاب" سے تعبیر تو کیا جاسکتا ہے۔ مگر انبیاء ماسبق کے تعلق سے برپا ہونے والے حوادث جس مفہوم میں عذابِ الٰہی قرار پاتے ہیں۔ اس مفہوم میں اب کسی بھی حادثے کو عذابِ الٰہی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے۔ اسے ذرا واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ

(۱) کچھ حوادث ارضی وسماوی وہ ہوتے ہیں، جو معلوم ومعروف قوانینِ فطرت کے مطابق واقع ہوتے رہتے ہیں۔ کسی قوم کی بداعمالیوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(۲) کچھ حوادث وہ ہوتے ہیں جو انسانی اعمال سے بالکل جڑے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ انہی کے نتیجے میں برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے ان حوادث کا معلوم ومعروف فطری قوانین کے تحت ہونا کچھ ضروری بھی نہیں ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں بھی قدرتی حوادث کا ظہور دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ "قانونِ خرقِ عادت" کے مطابق بھی واقع ہوسکتے ہیں۔

دراصل خرقِ عادت کا قانون بھی فطرت کا ایک قانون ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس قانون کی سائنسی توجیہ ابھی نہیں ہو پائی ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں، جب اس قانون کی عقدہ کشائی بھی ہوجائیگی اور فطرت کا یہ سربستہ غیر معلوم قانون بھی دریافت ہوجائے گا۔

ہمارے خیال میں پاکستان میں آنے والا زلزلہ ایک طبعی حادثہ تھا۔ زلزلہ کی زد پر رہنے کے باعث جاں بحق یا متاثر ہونے والوں کی اخلاقیات ومذہبیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے معروف

معنی میں اسے عذابِ الٰہی قرار نہیں دیا جاسکتا، جیسا کہ بعض دانشوروں کا اس امر پر اصرار ہے۔ ویسے یہ اصرار شاید کچھ ایسا بلاوجہ بھی نہیں۔ دراصل انبیاء ماسبق کی گستاخ اور نافرمان قوموں پر آنے والے عذاب کے بار بار تذکرے نے لوگوں کو ایسا سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔

طبعی حوادث کا اعمال کی دنیا سے کیا تعلق ہے؟ یہ ہے وہ سوال کہ جس کی تلاش میں، میں نے انبیائے کرام کی نافرمان قوموں کا قرآن کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے۔ آیئے آپ بھی اس مطالعے میں شریک ہوجایئے۔

قومِ نوح علیہ السلام کے عذاب کا بیان

ہمارے سلسلۂ بیان کی سب سے پہلی کڑی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر آنے والا عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ولقد ارسلنا نوحا الیٰ قومہ........ الخ (ھود/۲۵)

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔

واضح ہو کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے۔ بلکہ آپ کی قوم آپ سے پہلے، بہت سے رسولوں کی تکذیب کرچکی تھی۔

کذبت قوم نوح ن المرسلین o (الشعراء/۱۰۵)

قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی۔

واوحی الیٰ نوح انہ لن یومن من قومک الا من قد امن فلا تبتئس بما کانوا یفعلون o (ھود/۳۶)

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمہاری قوم سے کوئی بھی ایمان نہیں لائے گا۔ سوائے ان کے جو ایمان لاچکے پس تم ان کے کرتوتوں پر افسردہ نہ ہو۔

اس وحی کے بعد ہی حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کے لئے اپنے رب کو پکارا۔

وقال نوح رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا o (نوح/۲۶)

نوح نے پکارا کہ اے میرے پروردگار زمین پر کافروں میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑ۔

ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی یہ دعا اس یقین کے بعد کہ ان کے نہ ماننے والے، اپنی روش پر ہمیشہ قائم رہیں گے۔ خدائی اطلاع (وحی خداوندی) پر ایک قسم کا اظہارِ تسلیم تھا۔ جس کے جواب میں اللہ کا عذاب ایک "طبعی حادثہ" بن کر نمودار ہوا۔ یہ عذاب، جہاں نافرمانوں پر احقاقِ حق اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابطالِ باطل کا کھلا مظاہرہ تھا۔ وہیں کفر و اسلام کے مابین مابہ الامتیاز نشان بھی تھا۔ یعنی یہ وہ عذاب نہ تھا کہ جسے فقط اتفاق، فطری حادثہ، طبیعی واقعہ اور قدرتی سانحہ قرار دیا جا سکے۔ کیونکہ قوم نوح پر آنے والے عذاب کی نوعیت، پروردگار عالم نے بایں الفاظ بیان فرمائی ہے۔

حتیٰ اذا جآء امرنا وفا ر التنّور ..... الخ (ھود / ۴۰)

یہاں تک کہ ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور نے جوش مارا۔ (یعنی پانی چاروں طرف پھیل گیا۔)

عربی لغت میں تنور کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) کل مفجر ماء ..... پانی پھوٹنے کی جگہ یعنی چشمہ۔

(۲) محفل ماء الوادی ..... وادی کے پانی کے جمع ہونے کی جگہ (اقرب الموارد)

(۳) وجہ الارض ..... سطح زمین (تاج العروس)

قرآن مجید کے مطابق، پانی آسمان سے بھی برسا اور زمین سے بھی نکلا اور ان دونوں پانیوں کے ملنے سے قوم نوح پر عذاب آیا۔

ففتحنا ابواب السمآء بماء منھمر ○ وفجرنا الارض عیونا فالتقی المآء علیٰ امر قد قدر ○ (القمر / ۱۱-۱۲)

اس وقت ہم نے بادل کے دریچے وا کر دیئے اور بہت زیادہ اور مُسلسل پانی برسنے لگا اور زمین میں چشمے بہا دیئے پس پانی ایک امر (یعنی عذاب) کے لئے جمع ہو گیا۔ جس کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

مُنھمر کا مادہ ھمر ہے۔ الھمر صب الدمع او الماء (المفردات) آنسوؤں اور پانی کے (کثرت سے) بہنے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ لفظ جانور کے تھن کو دودھ کے آخری قطرے تک دوہنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ نیز یہ لفظ مینہ کے برسنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ التقاء ماء سے مراد ہے، پانیوں کا اکٹھا ہونا۔ یعنی ایک وہ پانی، جو بادل سے برسا اور دوسرا وہ جو زمین سے نکلا۔ انہی دونوں پانیوں کے جمع ہونے پر "طوفانِ نوح" کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

اس طوفان سے بچنے کی واحد سبیل وہ کشتی تھی، جسے امرِ خداوندی کے تحت بنایا گیا تھا۔ اور جس میں تمام اہل ایمان سوار کرائے گئے تھے اور وہ تمام جوڑے بھی، جن کی ضرورت اہل ایمان کو ہو سکتی تھی۔

قلنا احمل فیھا من کل زوجین اثنین واھلک الا من سبق علیہ القول ومن اٰمن ط وما اٰمن معہ الا قلیل ○ (ھود / ۴۰)

ہم نے کہا کہ اس میں ہر (ضرورت کی) شے کے نر و مادہ، دو دو لے لو اور اپنے اہل کو بجز جس

کے متعلق پہلے حکم ہو چکا (نوح کی بیوی اور ایک بیٹا) اور ان کو جو ایمان لائے، اور اس کے ساتھ تھوڑے ہی ایمان لائے تھے۔

اس عذابِ خداوندی سے قوم نوح کا کوئی کافر زندہ نہ بچ سکا۔ یہ وہ عذاب تھا، جو کامل اتمامِ حجت کے بعد، رسول گرامی کے منکرین و معاندین و مکذبین کی جڑ کاٹ دینے کے لئے نازل ہوا۔ گویا یہ فیصلہ کن عذاب تھا۔ جو طوفان کی شکل میں آیا۔

فاخذھم الطوفان وھم ظالمون ○ (عنکبوت / ۱۴)

پس ان کو طوفان نے پکڑا اور وہ ظالم لوگ تھے۔

یہاں طوفان کا لفظ خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ اس کا مادہ "طوفٌ" ہے۔ جس کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہیں۔ عام استعمال میں اہل عرب اس سے وہ تند ہوا مراد لیتے ہیں۔ جو تیزی سے چکر کھاتی ہوئی اٹھتی ہے۔ ایک جاہل شاعر راعی اپنی اونٹنی کی تعریف میں کہتا ہے۔

تمسی اذا العیس ادرکنا نکا ئثھا

خرقاء یعتاد ھا الطوفان والزود

دوسری زبانوں میں اس قسم کی تند ہوا کے لئے اس طرح کے الفاظ ہیں۔ مثلاً فارسی میں اس کو گردباد، انگریزی میں CYCLONE اور ہندی میں اس کے لئے بگولے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس ہوائے تند کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے شدت کی بارش ہوتی ہے اور سمندر کا پانی جوش میں آ جاتا ہے۔ پھر اسی جوشِ آب کو "طوفان" کہا جاتا ہے۔ ؏

صاحب تاج العروس کے بقول طوفان، اس ہمہ گیر موت، مصیبت یا حادثہ کو کہتے ہیں، جو قوم کو چاروں طرف سے گھیر لے اور ہر شے پر چھا جائے، مثلاً غرقابی، قتل و غارت گری، بارش، جو زوردار ہونے کی وجہ سے بستیوں کو بہالے جائے۔

آمدم برسر مطلب اس طوفانِ عظیم میں کسی فردِ مومن کا کوئی بال بیکا نہ ہوا۔ سب کے سب خیر و عافیت سے اپنی اپنی منزلوں پر پہنچے۔ کشتی میں بیٹھتے وقت حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی جس نے اُسے ظالم قوم سے نجات بخشی۔

فاذا استویت انت ومن معک علی الفلک فقل الحمد للہ الذی نجنا من القوم الظّٰلمین ○ وقل رب انزلنی منزلا مبارکا وانت خیر المنزلین ○ (المؤمنون / ۲۸-۲۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جب تم اور تمہارے رفقاء، کشتی میں بیٹھ جائیں تو کہنا کہ سب تعریف و شکر گزاری اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں ظالموں سے نجات دی اور کہنا اے پروردگار! ہمیں بابرکت جگہ پر پار لگا کر تو بہترین پار لگانے والا ہے۔

فا نجینٰہ واصحاب السفینۃ ....الخ (عنکبوت/۱۵)

پھر ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آیا وہ فیصلہ کن تھا۔ فقط نیچرل فینو مینا (NATURAL PHANOMENON) کے تحت بیان ہونے والا کوئی اتفاقی حادثہ تھا۔ کیونکہ اگر اسے فقط ایک حادثہ قرار دیا جائے تو پھر انسانی اعمال کی دنیا سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور ان عذابوں کی انذاری حیثیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ نیز پھر سوچئے کہ اسے اعمال انسانی کا نتیجہ قرار دینے کی ضرورت قرآن مجید نے کیوں ضروری سمجھی ہے؟

سورۂ ھود میں آتا ہے۔

وھی تجری بھم فی موج کالجبال.....(ھود/۴۲)

اور وہ (کشتی) انہیں پہاڑ جیسی لہروں میں لئے چلی جا رہی تھی۔

اس فقرہ میں موج کو پہاڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ پہاڑ کی طرح موجوں کا اٹھنا اس حالت سے مخصوص ہے، جب تیز آندھی ہو یہاں سبب موجوں کا ذکر در اصل ہوائے تند و تیز کے چلنے کی دلیل ہے۔ اور ویسے بھی اثر کا ذکر کر کے موثر کو ظاہر کرنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ قرآن مجید نے ہوا اور موجوں کے باہمی تلازم کو درج ذیل آیت میں نمایاں کر دیا ہے۔ اور اس تلازم کو قریب الفہم بھی بنا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ھوالذی یسیرکم فی البر والبحر حتیٰ اذا کنتم فی الفلک وجرین بھم بریح طیبۃ وفرحوا بھا جاءتھا ریح عاصف وجاءھم الموج من کل مکان...(یونس/۲۲)

وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انہیں اچھی ہوا کی مدد سے لیکر چلتی ہے اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ انہیں تند ہوا آ لیتی ہے۔ اور ہر طرف سے اُن پر لہریں چڑھ آتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ وھی تجری بھم (اور وہ ان کو لیکر چلتی ہے) کے الفاظ میں خود ہوا کا تا

قابل تردید ثبوت موجود ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے دوسری جگہ اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہوا کو روک دے تو کشتیاں سمندر کی سطح پر کھڑی رہ جائیں۔

ومن اٰیٰتہ الجوار فی البحر کالاعلام ان یشاء یسکن الریح فیظللن رواکد علیٰ ظھرہ ... (الشوریٰ / ۳۲۔۳۳)

اور اس کی نشانیوں میں سے سمندر میں پہاڑوں جیسی کشتیاں ہیں اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے۔ سو وہ اس کی پیٹھ پر کھڑی رہ جائیں۔

چوں کہ طوفان سے بچنے کی ملاذی محض کشتی تھی۔ جسے حضرت نوح علیہ السلام بنا رہے تھے۔

ویصنع الفلک وکلما مر علیہ ملا من قومہ سخروا منہ ط قال ان تسخروا منا فانا نسخر منکم کما تسخرون ○فسوف تعلمون من یاتیہ عذاب یخزیہ ویحل علیہ عذاب مقیم○(ھود/۳۸۔۳۹)

اور نوح کشتی بناتے تھے اور جب بھی ان کی قوم کے سرکردہ لوگ ان کے پاس سے گزرتے تو انکی ہنسی اُڑاتے نوح نے فرمایا۔ اگر تم ہماری ہنسی اُڑاتے ہو تو (بہت جلد) ہم تمہاری ہنسی کا جواب دیں گے جیسا کہ تم ہنسی اُڑاتے ہو اور تم بہت جلد جان لوگے کہ وہ رسوا کن عذاب الٰہی (کہ جس سے میں تمہیں ڈراتا ہوں) کس پر آتا ہے۔ یعنی کبھی نہ ٹلنے والا رسوا کن (فیصلہ کن) عذاب کس پر اترتا ہے۔

آپ اس مکالمے کو بار بار پڑھئے اور دیکھئے کہ رب کے فیصلہ کن عذاب کا تعلق، انسانی اعمال سے مربوط اور متصل ہے یا نہیں؟ کیا اس عذاب کو کسی امر حادثاتی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ بلاشبہ یہ وہ عذاب ہے کہ جو انسانی بداعمالیوں کے نتیجے میں ہی ظہور میں آیا تھا۔

پھر قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ قوم نوح کے منکروں نے حضرت نوح علیہ السلام سے، خود عذاب کا مطالبہ کیا تھا۔

قالوا یا نوح قد جادلتنا فاکثرت جدالنا فاتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین○قال انما یاتیکم بہ اللہ ان شاء وما انتم بمعجزین○(ھود/۳۲۔۳۳)

انہوں نے کہا اے نوح! تم نے ہم لوگوں سے بہت بحث و تکرار کر لی۔ اب لے آؤ اُس عذاب کو کہ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو۔ اگر سچے ہو۔ نوح نے جواباً کہا اگر اللہ کی مشیت مقتضی ہوئی کہ تم پر اپنا عذاب اتارے تو تم میں فرار کی طاقت نہ ہوگی۔

اس واقعے سے جو کچھ حقائق معلوم ہوئے اُن کا خلاصہ یہ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱) حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں پہلے پیغمبر نہ تھے۔ آپ سے پہلے بھی متعدد رسول آچکے تھے۔
(الشعراء/۱۰۵)

(۲) قومِ نوح نے پیغمبر سے خود عذاب مانگا تھا۔ (ھود/۳۲۔۳۳)

(۳) اللہ تعالیٰ نے نوح کو بتا دیا تھا کہ اب تمہاری قوم کا کوئی فرد بھی ایمان نہیں لائے گا۔ (ھود/۳۶)

(۴) پیغمبر نے اس وحی کے بعد ہی، اپنی قوم کی ہلاکت مانگی۔ (نوح/۲۶)

(۵) حضرت نوح کی قوم پر پانی کا عذاب آیا۔ جو آسمان سے بھی برسا اور زمین سے بھی نکلا۔
(القمر/۱۱۔۱۲۔ ھود/۴۰)

(۶) پانی کے اس عذاب کو "طوفان" کا نام دیا گیا۔ (عنکبوت/۱۴)

(۷) اس عذاب سے اہلِ ایمان کا ایک فرد بھی متاثر نہ ہوا۔ سب کے سب محفوظ رہے۔
(المومنون/۲۸۔۲۹ .... عنکبوت/۱۵)

قومِ ھود کے عذاب کا بیان

حضرت ھود علیہ السلام قومِ عاد کے پیغمبر تھے۔

والیٰ عاد اخاھم ھودا ۝ (ھود/۵۰)

اور قومِ عاد کی طرف اس کے ہم قوم ھود کو بھیجا۔

قومِ عاد کا ذکر سورۃ الفجر میں بایں الفاظ کیا گیا ہے۔

الم تر کیف فعل ربک بعاد ۝ ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلھا فی البلاد ۝ (الفجر/۶۔۸)

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ تیرے ربّ نے عاد کے ساتھ کیا کیا؟ (عاد) ارم بلند عمارت والوں (کے ساتھ) جن کی مثل شہروں میں پیدا نہ ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں حضرت ھود اور قومِ عاد کا مسکن سرزمین احقاف کو بتایا گیا ہے۔

واذکر اخا عاد ط اذا نذر قومہ بالاحقاف ... (الاحقاف/۲۱)

اور عاد کے بھائی (ھود) کو یاد کرو، جب انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ڈرایا۔

تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ عاد اپنے زمانے میں ایک مضبوط اور طاقتور قوم تھی، جس کا تصرف دور دور تک پھیل گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ عاد کو جو شان و شوکت عطا فرمائی تھی۔ اس کے بل پر یہ نافرمان قوم بہکنے اور کہنے لگی تھی کہ من اشد منا قوۃ (حٰمٓ سجدہ/۱۵) کون ہے، جو ہم سے

بڑھ کر قوت والا ہے۔ قومِ عاد نے بڑی پُرشکوہ عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ جو فنِ تعمیر اور سنگ تراشی کا اعلیٰ شاہکار تھیں۔ حضرت ھود علیہ السلام نے قوم سے فرمایا۔

اتبنون بکل ریع ایۃ تعبثون ۝ وتتخذون مصانع لعلکم تخلدون ۝ واذا بطشتم بطشتم جبارین ۝ (الشعراء/۱۲۸۔۱۳۰)

کیا تم لوگ ہر اونچی جگہ پر فضول یادگاریں بناتے ہو اور بڑے بڑے محل بناتے ہو۔ جیسے تمہیں ہمیشہ ہی رہنا ہے۔ اور جب تم (کسی کو) پکڑتے ہو تو بالکل جابر بن کر دارو گیر کرتے ہو۔

ریعٌ ریعۃ کی جمع ہے۔ امام راغب کے بقول الریع المکان المرتفع الذی یبدون من بعید۔ ہر ایک اونچی جگہ جو دور سے نظر آئے، اُسے ریع کہتے ہیں۔ رستہ اور وادی کو بھی کہتے ہیں۔ (تفسیر ابن جریر)

لہٰذا یہاں بلند عمارتوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلند عمارتیں صرف بڑے بڑے آدمیوں کی یادگاروں کے طور پر بنائی جاتی تھیں۔ اس لئے ان کو ایۃ کہا ہے۔ اور ان کی غرض صرف اپنے نام کی بڑائی اور نمود تھی۔ تعبثون سے ظاہر ہے کہ یہ شوقِ تعمیر کسی ضرورت کی بناء پر نہ تھا۔ مصانع سے مراد ہے جو وہ بناتے تھے اور اعلیٰ درجے کے مکانوں کو بھی مصانع کہتے ہیں۔ نیز اعلیٰ درجے کے قلعوں، محلوں اور پانی کے تالابوں کو بھی مصانع کہا جاتا ہے۔

ان سب چیزوں کی تعمیر بذاتِ خود کوئی امر معیوب نہیں۔ معیوب امر یہ ہے کہ لوگ ان عمارتوں کی محبت میں اپنے ربّ کو بھول جائیں۔ قومِ عاد کے بھی وہ بلند و بالا مکانات تھے، جو ان کی نافرمانی کے بعد برباد کر دیئے گئے، جو دیکھنے والوں کے لئے درسِ عبرت بن گئے۔

قومِ عاد پر خدا کا عذاب اترا۔

فارسلنا علیھم ریحاً صرصراً فی ایام نحسات لنذیقھم عذاب الخزی فی الحیوۃ الدنیا و لعذاب الاخرۃ اخزیٰ وھم لا ینصرون ۝ (حٰمٓ سجدہ/۱۶)

پس ہم نے ان پر سردی کے دنوں میں منحوس ہوا (تیز آندھی) چلائی۔ تاکہ انہیں دنیا کی زندگی میں عذابِ رسوائی کا مزہ چکھائیں اور عذابِ آخرت تو رسوا ترین ہوگا اور انہیں کوئی مدد نہ پہنچ سکے گی۔

اس آیت میں ریحاً صرصراً کے الفاظ آئے ہیں۔ ریح تو ہوا کو کہتے ہیں لیکن یہاں ہوا کی صفت صرصراً آئی ہے اس لئے اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ الصرۃ۔ القر، سردی یا سردی کی شدت کو کہتے ہیں۔ (تاج العروس) وہ سردی جس سے کھیتیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ (لین) زجاج نے کہا ہے کہ الصرۃ،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سخت چیخنے اور چلانے کو کہتے ہیں۔ ریح صرٌ صرصرا سخت آواز والی تیز ہوا کو کہتے ہیں۔ اور ایام نحسات، سخت سردی کے زمانے کو بھی کہا جاتا ہے۔ و قیل شدید ات البر د۔ (المفردات)

قرآن مجید میں قوم عاد کی تباہی کا ذکر، جس طرح ریحا صرصرا کے الفاظ میں آیا ہے۔ اسی طرح اُن سرمائی بادلوں کے ساتھ بھی آیا ہے۔ جو نہ صرف پانی سے خالی ہوتے ہیں بلکہ ہمیشہ رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوا کرتے ہیں۔

سورۂ احقاف میں آتا ہے۔

فلما راوہ عارضا مستقبل او دیتھم قالوا ھذا عارض ممطرنا بل ھوما استعجلتم بہٖ ریح فیھا عذاب الیم ٥تدمر کل شیء بامر ربھا فاصبحوا لا یُری الّا مساکنھم ط کذلک نجزی القوم المجرمین ٥ (الاحقاف ۲۴۔۲۵)

پھر جب ان لوگوں نے بادل کو اپنی وادیوں کے مقابل آتے دیکھا تو کہنے لگے۔ یہ تو بادل ہے ہم پر مینہ برسانے والا ہے۔ نہیں بلکہ یہ وہ ہے، جس کے لئے تم جلدی کرتے تھے، ہوا (آندھی) ہے۔ جسمیں دردناک عذاب ہے۔ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کردے گی۔ سو وہ ایسے ہوگئے کہ سوائے ان کے مکانوں کے اور کچھ دیکھنے کو نہیں رہا۔ اسی طرح ہم مجرم قوم کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول و العارض البادی عرضہ فتارۃ یخص بالسحاب (المفردات) عارض وہ چیز ہے، جو اپنے عرض یعنی فراخی کو ظاہر کرے۔ بعض اوقات بادل پر بولا جاتا ہے، جیسے یہاں عرب میں بادِ شمال صرصر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اور خشکی اور قحط کی نحوست ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ اسی لئے (حٰم سجدہ ۱۶) میں اسے ایام نحسات کہا گیا ہے۔ اور سورۃ القمر میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

انا ارسلنا علیھم ریحاً صرصراً فی یوم نحس مستمر ٥تنزع الناس کانھم اعجاز نخل منقعر ٥ (القمر ۱۹۔۲۰)

ہم نے اُن پر ایک تیز آندھی ایک دائمی سردی والے دن چلائی۔ وہ لوگوں کو یوں اکھاڑ پھینکتی تھی کہ وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔ یوم نحس، کے معنی سخت سردی والے دن بھی کیے گئے ہیں۔ اور یوں ان کی بدقسمتی کے دن مراد لئے گئے ہیں۔ اور ایک ہی دن کو الگ الگ لوگوں سے منسوب کرکے انہیں منحوس بھی کہا جاتا ہے اور مسعود بھی (روح المعانی) بہر حال بادِ صرصر کے یہ طوفان، عرب میں جاڑوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہی زمانہ ان کے ہاں نحوست اور فاقہ سمجھا جاتا ہے۔ مشہور شاعر فرزدق

کہتا ہے۔

بعثت لہ د۰۰ ا۰ لیست بلقحۃ

تدر اذا ما ھب نحسا عقیمھا

میں نے اس کے لئے کھجوری اور فربہ اُونٹنی بھیجی، جو اس وقت دودھ دیتی تھی، جب ٹھنڈی اور بانجھ ہوائیں چلتی تھیں۔ ۳۔

موسم سرما کی یہ تند ہوائیں، جب چلتی تھیں تو صاعقہ کی تمام آفتیں بھی اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ اس امر کی شہادت کہ قوم عاد کے عذاب کے سلسلے میں صاعقہ بطور عامل کے موجود تھی۔ سورہ حٰم سجدہ کی آیت ملاحظہ کیجئے۔

فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقہ مثل صاعقہ عاد و ثمود (حٰم سجدہ ۱۳)

سو اگر وہ منہ پھیر لیں تو آپ کہہ دیجئے، میں تمہیں عاد اور ثمود کی صاعقہ جیسی صاعقہ سے ڈراتا ہوں۔

صاعقہ بجلی کی کڑک کو کہتے ہیں (تاج العروس، محیط المحیط) صرف سخت آواز کو بھی کہتے ہیں۔ ابن فارس کے بقول یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ ہر مہلک عذاب کو بھی صاعقہ کہتے ہیں۔ (تاج و محیط) ہلاکت کے معنوں میں سورۂ طور میں جہاں کہا ہے کہ

فذرھم حتیٰ یلقوا یومھم الذی فیہ یصعقون ٥ (الطور ۴۵)

سو انہیں چھوڑ دے، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو ملیں، جسمیں ہلاک کئے جائیں گے۔

اسمیں ان کی اجتماعی بربادی اور قومی تباہی کو بیان کیا گیا ہے۔

تفصیلات بالا سے معلوم ہوا ہے کہ قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی کے سبب موسم سرما میں سخت ٹھنڈی ہواؤں کا عذاب بایں طور نازل فرمایا کہ ان پر ایسے بادل جھوم جھوم کر آئے، جو اپنے دامن میں کڑک اور گرج رکھتے تھے۔ اور وہ پانی کے بغیر تھے۔ لیکن ان کی اصل تباہی زیادہ تر ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔

واما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیہ ٥سخرھا علیھم سبع لیال و ثمانیۃ ایام حسوماً فتری القوم فیھا صرعیٰ ٥کانھم اعجاز نخل خاویہ ٥فھل تری لھم من باقیہ٥ (حاقۃ ۶۔۸)

اور عاد سخت ٹھنڈی ہوا (موسم سرما کی آندھی) سے ہلاک کئے گئے۔ اس نے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن چلائے رکھا۔ جس سے کاٹتی ہوئی، سو تو وہاں لوگوں کو یوں گرا ہوا دیکھتا ہے۔ گویا وہ گری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئی کھجور کے تنے ہیں۔ تو کیا تو ان میں سے کسی کو زندہ دیکھتا ہے؟

اور سورۃ ذاریات میں ہوا کو بطور عامل کے بایں الفاظ بیان کیا گیا۔

وفی عاد اذ ارسلنا علیهم الریح العقیم ٥ ما تذر من شیء اتت علیه الا جعلته کالرمیم ٥ (ذاریات ۵۱/۴۱-۴۲)

اور عاد میں (نشانی ہے) جب ہم نے ان پر تباہ کرنے والی ہوا بھیجی۔ وہ کسی چیز کو نہ چھوڑتی تھی، جس پر آجاتی اسے ریزہ ریزہ کر دیتی تھی۔

نافرمانوں پر انتہائی ٹھنڈی ہوا کا یہ عذاب قہر خداوندی بن کر ٹوٹ پڑا مگر اس عذاب میں اہل ایمان کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔

فانجینه والذین امنوا معه برحمة منا (الاعراف ۷/۷۲)

پھر ہم نے ہود کو اور انہیں جو ان کے ساتھ ایمان لائے اپنی رحمت سے بچا لیا۔

ولما جاء امرنا نجینا هودا والذین امنوا معه برحمة منا ونجینهم من عذاب غلیظ ٥ (ہود ۵۸)

اور جب ہمارا حکم (یعنی عذاب) آ گیا۔ ہم نے ہود کو اور انہیں جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔ بلاشبہ ہم نے انہیں سخت عذاب سے بچا لیا۔

اہل کفر کا ہلاک ہونا اور اہل ایمان کا بچ جانا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ عذاب بھی طوفان نوح کی طرح ایک فیصلہ کن عذاب تھا کہ جس نے اپنے ظہور سے کفر و اسلام کے درمیان امتیاز قائم کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے عذابوں کو فقط امر اتفاقی و فطری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی ارضی و سماوی حادثہ سمجھا جا سکتا ہے۔ چونکہ قرآن مجید نے خود اسے انسانی بداعمالیوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس لئے اخلاقی اقدار اور طبعی حوادث میں کوئی ایسی مناسبت ضرور ہے کہ جو بظاہر تو غیر مرئی ہے مگر بعض وقت کی زندگی میں ہمیں اعجازی رنگ میں دکھائی دیتی ہے۔

خلاصہ کے طور پر عرض ہے کہ

(۱) قوم عاد پر سخت سردی کے موسم میں ٹھنڈی اور تیز ہوا کا عذاب آیا۔ (حٰم سجدہ ۴۱/۱۶)

(۲) یہ ہوائیں سات راتیں اور آٹھ دن، مسلسل چلتی رہیں۔ (حاقہ ۶۹/۶-۸)

(۳) قوم عاد کے عذاب میں صاعقہ ایک عامل کے طور پر موجود تھی۔ (القمر ۵۴/۱۹-۲۰)

(۴) قوم عاد کے عذاب میں "ہوا" ایک اہم عامل کے طور پر موجود تھی۔ (ذاریات ۵۱/۴۱-۴۲)

(۵) اس عذاب میں اہل کفر کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچ سکا۔ (حاقہ ۶۹/۶-۸)

(۶) تمام اہل ایمان کو عذاب سے بچا لیا گیا۔ (ہود ۵۸)

قوم صالح کے عذاب کا بیان

قوم ثمود بھی، عاد کی طرح عرب کی قدیم اقوام میں سے ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام اس قوم کی طرف مبعوث کیے گئے۔

والی ثمود اخاهم صالحا قال یقوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره ط قال قد جاءتکم بینة من ربکم ط هذه ناقة الله لکم فذروها تاکل فی ارض الله ولا تمسوها بسوء فیاخذکم عذاب الیم ٥ (الاعراف ۷/۷۳)

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے ہم قوم صالح کو بھیجا۔ (اس نے) کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لئے اسکے سوا کوئی معبود نہیں، یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک کھلا ہوا نشان آ چکا۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے نشان ہے۔ سو اسکو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اور اس کو کوئی برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگانا۔ ورنہ تمہیں دردناک عذاب آ پکڑے گا۔

یاد رہے کہ ناقہ کی اضافت اللہ کی طرف محض تعظیم و تخصیص کے لئے ہے۔ جیسے بیت اللہ میں بیت کی اضافت اللہ کی طرف (امام قرطبی) کیونکہ اللہ کی طرف سے وہ اونٹنی بطور نشانی قرار دی گئی تھی کہ جو کوئی اس کو مارے گا وہ تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ جس طرح بیت اللہ کو ایک نشان قرار دیا گیا کہ جو کوئی اس کو برباد کرنا چاہے گا وہ برباد کر دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ اونٹنی کا نشان، عذاب کے آنے کے لئے بطور علامت کے تھا۔ جیسا کہ قد جاءتکم بینة من ربکم سے ظاہر ہے۔ سورہ شعراء میں آیا ہے کہ منکروں نے حضرت صالح علیہ السلام سے ایک نشان مانگا تھا۔ یہ اونٹنی ان کا نشان مطلوب ہی تھی۔

ما انت الا بشر مثلنا فات بایة ان کنت من الصادقین ٥ قال هذه ناقة لها شرب ولکم شرب یوم معلوم ٥ (الشعراء ۲۶/۱۵۴-۱۵۵)

تم کچھ نہیں مگر ہماری طرح ایک انسان ہو۔ سو کوئی نشانی لاؤ اگر تم سچے ہو۔ (صالح نے) کہا یہ اونٹنی ہے۔ اسکے لئے پینے کا حصہ ہے اور تمہارے لئے ایک وقت معلوم کا پینا تو ہے ہی۔ (یعنی اونٹنی سے تمہارے پینے کی باری میں کوئی حرج واقع نہیں ہوگا)

شرب یوم معلوم سے مراد وقت مقررہ پر پانی لینا ہے۔ یوم سے مراد وقت ہے نہ کہ دن۔ ایک انگریزی مترجم ایم۔ ایچ شاکر نے اس آیت کا ترجمہ بالکل صحیح مفہوم میں ادا کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

This is a she camal;She shal have her portion of water and you have your portion of water on an appointed time[۳]

یوم معلوم سے یہ ثابت کرنا غلط معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن اونٹنی کے پانی پینے کے لئے مقرر تھا اور ایک دن ساری قوم کے لئے۔ اسی طرح یہ جو کہا جاتا ہے کہ اونٹنی اپنی باری میں سارے شہر کا تن تنہا پانی پی جاتی تھی، یہ بھی محض قصہ ہے۔ جس کی اصل ثابت نہیں۔

ونبئھم ان الماء قسمۃ بینھم کل شرب محتضر ٥(القمر/۲۸)

اور انہیں خبر دے دیجئے کہ پانی ان کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر پینے کی باری میں، باری والا حاضر ہو۔

"انّ الماءَ قسمۃ بینھم " کے معنی یوں بیان کئے گئے ہیں کہ پانی، ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور پھر اس سے یہ قصہ بنایا گیا ہے کہ ایک دن اونٹنی، سارا پانی پی جاتی تھی اور لوگوں کو اس دن پانی نہ ملتا تھا۔ حالانکہ یہ بات نہ تو قرآن کریم میں آئی ہے اور حدیث میں۔ یہاں پانی کی تقسیم، افراد کے مابین مراد ہے نہ کہ اونٹنی اور افراد کے مابین۔ مطلب یہ کہ پانی تم میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ یہ علاقہ پہاڑی تھا اور پہاڑی علاقوں میں جب کافی یا زیادہ بارشیں نہ ہوں تو وہاں پانی کی قلت ہو جاتی ہے۔ پس "اونٹنی کی باری" یا "اونٹنی کے حصے" کا مطلب یہ بنتا ہے کہ تم نے تو آپس میں پانی بانٹا ہوا ہے۔ لیکن اس وجہ سے اونٹنی کو پانی سے روکا نہ جائے، خواہ باری ایک فریق کی ہو یا دوسرے فریق کی۔

اس مفہوم کی تائید قرآن مجید کی ایک اور آیت سے بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔

ویٰقوم ھذہ ناقۃ اللہ لکم اٰیۃ فذروھا تاکل فی ارض اللہ ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب قریب ٥(ہود/۶۴)

اے میری قوم! یہ اونٹنی اللہ کی ہے اور تمہارے حق میں ایک نشان۔ سو اسے چھوڑ دو، اللہ کی زمین میں چرے اور اسے برائی کی نیت سے ہاتھ نہ لگانا۔ ورنہ تمہیں قریبی عذاب آ پکڑے گا۔ (یعنی ایسا عذاب جسکے آنے میں دیر نہ لگے گی)

ظاہر ہے کہ یہاں اونٹنی کے چرنے میں کسی متبادل باری کا مضمون نہیں آیا۔ بلکہ مطلق چرنے کا مضمون آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹنی کو پانی پینے سے نہ روکا جائے، ویسے ہی کسی چراگاہ میں

چرنے سے بھی نہ روکا جائے۔

اونٹنی کے مارنے میں ایک طرح کی تمہید معلوم ہوتی ہے کہ شاید اس کے بعد، ان کا اگلا ہدف خود حضرت صالح علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کے خلاف ان کی اس سازش کا ذکر سورہ نمل کی آیات ۴۸۔۴۹ میں بھی موجود ہے کہ وہ آپ اور آپ کے تمام متبعین کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ پس اس اونٹنی کو مار دینا اس امر کی علامت تھا کہ اب وہ لوگ، حضرت صالح علیہ السلام کو بھی قتل کر دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عقر ناقہ کے جرم پر اللہ نے اپنا عذاب نازل فرمایا۔

فعقروھا فقال تمتعوا فی دارکم ثلٰثۃ ایام ط ذٰلک وعدٌ غیر مکذوب ٥(ہود/ ۶۵)

پس انہوں نے اُسے مار ڈالا تب (صالح نے) کہا تم اپنے گھروں میں تین دن اور بسر کر لو۔ یہ ایسا وعدہ ہے جسمیں ذرا جھوٹ نہیں۔

اور فرمایا:

فعقروا الناقۃ وعتوا عن امر ربھم وقالوا یٰصٰلح ائتنا بما تعدنا ان کنت من المرسلین ٥(الاعراف/۷۷)

پس انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے اے صالح لے آؤ (وہ عذاب) جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو اگر تم پیغمبروں میں سے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے عذاب الٰہی کا مطالبہ خود کیا تھا جس کے جواب میں پروردگار عالم نے اپنا وہی فیصلہ کن عذاب اتارا جو قوم نوح اور قوم عاد پر اتارا تھا۔

ذیل میں عذاب کی آیات دیکھئے۔

واما ثمود فھدینٰھم فاستحبوا العمیٰ علی الھدیٰ فاخذتھم صٰعقۃ العذاب الھون بما کانوا یکسبون ٥(حٰم سجدہ/۱۷)

اور رہے ثمود تو ہم نے انہیں رستہ دکھایا پر انہوں نے اپنی بے بصیرتی کو ہدایت پر ترجیح دی، پس ذلت کے عذاب کی ہولناک آواز نے انہیں آ پکڑا بہ سبب اس کے جو وہ کرتے تھے۔

واخذ الذین ظلموا الصیحۃ فاصبحوا فی دیارھم جٰثمین ٥ کان لم یغنوا فیھا ط(ہود/۶۷۔۶۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جو ظالم تھے انہیں ہولناک آواز نے آ پکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے گویا کہ ان میں بسے ہی نہ تھے۔

فاخذتهم الرجفة فاصبحوا فی دارهم جٰثمين o (الاعراف/۷۸)

پس ان کو زلزلے نے پکڑا تو اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

فاما ثمود فاهلكوا بالطاغيه (الحاقہ/۵)

سو ثمود زور کی کڑک سے ہلاک کئے گئے۔

مذکورہ بالا آیات میں عذاب الٰہی کی تفصیل چار الگ الگ لفظوں میں بیان ہوئی ہے جو بالترتیب یہ ہیں۔

(۱) صاعقہ (۲) صیحہ (۳) الرجفہ (۴) طاغیہ

صاعقه: کا ذکر قوم عاد کی ہلاکت میں بھی آیا ہے۔ صاعقہ بجلی کی کڑک کو کہتے ہیں اس کی جمع صواعق آتی ہے (تاج و محیط) ابن فارس کے بقول اس کے معنی سخت آواز کے ہیں بلکہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں اور بظاہر یہاں بھی اس معنی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

صیحه: قرآن کریم میں صیحہ کا لفظ اس آواز کے لئے آیا ہے جو زلزلے کے وقت پیدا ہوتی ہے یا کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کے وقت۔ امام راغب کے بقول صیحہ آواز بلند کا نام ہے۔ سورہ القمر میں ارشاد فرمایا گیا:

انا ارسلنا عليهم صيحه فكانوا كهشيم المحتظر (القمر/۳۱)

ہم نے ان پر ایک ہی چنگھاڑ بھیجی سو وہ باڑ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح چورا چورا ہو گئے۔

رجفه: کسی چیز کے متحرک ہو جانے یا لرز جانے کو کہتے ہیں۔ امام راغب کے بقول رجف اضطراب شدید کو کہتے ہیں۔ ارجفت الريح الشجر کا مطلب ہے ہوا نے درختوں کو ہلا ڈالا ارجفت الارض کا مطلب ہے زمین متزلزل ہوئی۔ سورہ النزعٰت میں ہے یوم ترجف الراجفه (نازعات/۶) جس دن لرز جانے والی لرز جائے گی۔

يوم ترجف الارض والجبال وكانت الجبال كثيبا مهيلا o (المزمل/۱۴)

جس دن زمین اور پہاڑ کانپ اٹھیں گے اور پہاڑ پراگندہ ریت کا تودہ ہو جائیں گے۔

طاغيه: بجلی کی شدید کڑک کو کہتے ہیں اور قتادہ کے نزدیک اس سے مراد صیحة العذاب ہے۔ (لسان العرب)

ان چاروں لفظوں میں عذاب کی مختلف کیفیات یا مدارج کو بیان کیا گیا ہے۔ اگر ان سب کو

جمع کیا جائے تو ایک مہیب زلزلہ متصور ہوتا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بقول بعض مفسرین نے کڑک اور چیخ سے زلزلہ مراد لیا ہے۔ اس بنا پر کڑک اور چیخ کے لحاظ سے آتش فشانی زلزلہ ہوگا اور جغرافیہ نویسان سابق و حال تسلیم کرتے ہیں کہ ثمود کے مقامات آتش فشاں مادہ سے لبریز ہیں۔ ؎۵ عبدالماجد دریابادی کے بقول صیحہ کے معنی چیخ چنگھاڑ یا بلند آواز کے ہیں اور سورہ اعراف میں اس موقع کے لئے رجفہ آیا ہے۔ جس کے معنی زلزلے کے ہیں۔ لیکن زلزلہ اور بلند آواز کے درمیان منافات ذرا بھی نہیں ہے۔ جس کے لئے ضرورت تطبیق کی پڑے۔ بلکہ زلزلہ اور سخت گڑگڑاہٹ کا ساتھ تو مشاہدہ میں عموماً آچکا ہے۔ ؎۶

یہاں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ صاعقہ کا ذکر قوم عاد میں بھی آیا ہے اور قوم ثمود میں بھی اس لئے دونوں قوموں کے عذاب میں یکسانیت ہونی چاہئے اور یہ کہ جس طرح الگ الگ آیا ہے اسی طرح اکٹھا بھی آیا ہے۔

فان اعرضوا فقل انذرتكم صاعقة مثل صاعقه عاد وثمود (حٰم سجدہ/۱۳)

سو وہ اگر منہ پھیریں تو کہہ دیجئے کہ میں تمہیں عاد اور ثمود کے عذاب جیسے عذاب سے ڈراتا ہوں۔

مگر بات اصل میں یہ ہے کہ قوم عاد کے حوالے سے صاعقہ کے ذکر کے ساتھ دیگر امور شدیدہ کا بھی ذکر ہے جس میں اصل عامل ہوائے تیز و تند ہے۔ جبکہ ثمود کی تباہی میں ایسا نہیں ہے۔ اور یہاں کسی ہوائے تیز و تند کا تذکرہ نہیں ملتا۔

بہرحال قوم ثمود پر (زلزلے کا) عذاب ان کی اپنی خواہش کے مطابق آیا۔ (الاعراف/۷۷) جس نے حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دیا۔ کیونکہ یہ عذاب اہل کفر پر آیا نہ کہ اہل ایمان پر۔ اہل ایمان کو اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے بچا لیا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔

(۱) ونجينا الذين امنوا وكانوا يتقون o (حٰم سجدہ/۱۸)

اور ہم نے انہیں بچا لیا۔ جو ایمان لائے اور تقویٰ کی پیروی کرتے تھے۔

(۲) وانجينا الذين امنوا وكانوا يتقون o (النمل/۵۳)

اور ہم نے انہیں نجات دی۔ جو ایمان لائے اور خدائی احکام کی پابندی کرتے تھے۔

(۳) فلما جاء امرنا نجينا صلحا والذين امنوا معه برحمة منا (ہود/۶۶)

سو جب ہمارا فیصلہ (عذاب) آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان کو، جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ (اس سے) بچا لیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ثمود پر آنے والا عذاب اپنی کیفیت اور نتیجہ کے اعتبار سے قوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوح اور قوم عاد کے عذاب کی طرح تھا کہ جس نے کافروں کی جڑ کاٹ کے رکھ دی اور اہلِ ایمان کو بچا کر حق کا احقاق اور باطل کا ابطال کر دیا۔ یہ عذاب بھی فقط کسی نیچرل پروسس کا نتیجہ نہ تھا اور نہ ہی اتفاقاً پیش آنے والا کوئی ارضی وسماوی حادثہ تھا۔ بلکہ یہ وہ عذاب تھا کہ جو انھوں نے اپنے پیغمبروں سے خود طلب کیا تھا۔ اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی طرف مبعوث ہوئے۔ (الاعراف/۷۳)

(۲) قوم ثمود کے لئے عذابِ الٰہی کے نزول کے لئے "عقرِ ناقہ" کو سبب بنایا گیا۔ (ہود/۶۵)

(۳) عقرِ ناقہ کے بعد، قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے عذابِ خداوندی کا مطالبہ کیا۔ (الاعراف/۷۷)

(۴) قوم ثمود پر صاعقہ کا عذاب اترا۔ (حم سجدہ/۱۷)

(۵) صیحہ کا عذاب اترا۔ (ہود/۶۶۔۶۸)

(۶) رجفہ کا عذاب اترا۔ (الاعراف/۷۸)

(۷) طاغیہ کا عذاب اترا۔ (الحاقہ/۵)

(۸) حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے متبعین کو بچا لیا گیا۔ (حم سجدہ/۱۸۔ نمل/۵۳۔ ہود/۶۶)

قومِ لُوط کے عذاب کا بیان

حضرت لُوط علیہ السلام قوم سدوم کی طرف پیغمبر مبعوث ہوئے۔ یمن سے بحرِ احمر کے کنارے تجارتی قافلوں کی ایک سڑک حجاز و یمن سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی۔

قوم لوط کے جس سنگین جرم کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ وہ اغلام پرستی ہے۔ دیگر جرائم کے ساتھ یہ ان کا جرمِ اصلی تھا اس لئے اس کو متعدد آیات میں نمایاں کیا گیا ہے۔

پہلی آیت: ولوطا اذ قال لقومہ اتاتون الفاحشۃ ما سبقکم بہا من احد من العلمین o (الاعراف/۸۰)

انکم لتاتون الرجال شہوۃ من دون النسآء بل انتم قوم مسرفون o (الاعراف/۸۱)

اور جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسی کھلی بے حیائی کرتے ہو، جو تم سے پہلی قوموں میں سے کسی نے نہیں کی۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت رانی کے لئے آتے ہو، بلکہ تم حد سے نکل جانے

والے لوگ ہو۔

دوسری آیت: اتاتون الذکران من العالمین o وتذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم ط بل انتم قوم عدون o (الشعراء/۱۶۵۔۱۶۶)

کیا تم تمام خلق سے مردوں کے پاس جاتے ہو۔ اور ان عورتوں کو چھوڑتے ہو، جو تمہارے ربّ نے تمہارے لئے پیدا کیں، بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔

تیسری آیت: ولوطا اذقال لقومہ اتاتون الفاحشۃ وانتم تبصرون o ائنکم لتاتون الرجال شہوۃ من دون النسآء ط بل انتم قوم تجہلون o (نمل ۵۴۔۵۵)

اور لُوط نے جب اپنی قوم سے کہا کیا تم کھلی آنکھوں کے ساتھ ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو، کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت سے آتے ہو بلکہ تم شدت جذبات سے مغلوب ہو جانے والے لوگ ہو۔

چوتھی آیت: ولوطا اذقال لقومہ انکم لتاتون الفاحشۃ ما سبقکم بہا من احد من العلمین o ائنکم لتاتون الرجال وتقطعون السبیل وتاتون فی ... المنکر ط (عنکبوت/۲۸۔۲۹)

اور جب لُوط نے اپنی قوم سے کہا کیا تم نے ایسی کھلی بے حیائی اختیار کی ہے جسے تم سے پہلے اہلِ عالم میں سے کسی نے نہیں کی۔ کیا تم مردوں کے پاس آتے ہو اور فطرت کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو۔

یہاں تقطعون السبیل کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ تم اس طرح اس راستے کو منقطع کرتے ہو، جسے فطرت نے افزائشِ نسل انسانی کے لئے وضع کیا ہے۔ اور "تقطعون السبیل" سے راہ چلتے لوگوں سے مال چھیننا بھی مراد لیا گیا ہے۔ بایں معنی قوم لوط کا دوسرا جرم سرقہ، ڈاکہ زنی اور راہزنی تھا، اور مجلس میں بُرے کام کرنے کا ذکر اس لئے کیا تا کہ معلوم ہو کہ ساری قوم کی حالت خراب ہو چکی تھی اور وہ ایک دوسرے کا لحاظ کئے بغیر برُا کام کر لیا کرتے تھے۔

اذا فاتک الحیاء فافعل ما شئت

حضرت لُوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو بارہا سمجھایا کہ وہ اس فعلِ بد سے باز آجائیں اور تہذیبِ نفس کے خوگر ہو جائیں، مگر وہ بجائے اصلاح کے افساد پر مائل ہوئے۔ اخراجِ پیغمبر کے قائل ہو کر ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گستاخی کے مرتکب ہوئے۔ (الاعراف/۸۲، نمل/۵۶) بلکہ معاملہ یہاں تک بڑھا کہ

قالوا ائتنا بعذاب الله ان كنت من الصادقين ۝ (عنکبوت/۲۹)

انہوں نے کہا ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ اگر تم سچے ہو۔

پیغمبر سے عذابِ الٰہی کی طلب اس بات کی علامت تھی کہ وہ قوم بہرہ پذیر ہونے والی نہیں۔ اور جب کوئی قوم گمراہی کی اس آخری اسٹیج پر پہنچ جائے تو خدا کا عذاب، حق و باطل کا فرق قائم کرنے کے لئے مسلط کر دیا جاتا ہے اور اس طرح دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ارشاد فرمایا:

(۱) انا منزلون علىٰ اهل هذه القرية رجزاً من السماء بما كانوا يفسقون ۝ (عنکبوت/۳۴)

ہم اس بستی کے رہنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔ اسلئے کہ وہ نافرمانی کرتے ہیں۔

(۲) قالوا انا أرسلنا الىٰ قوم مجرمين ۝ لنرسل عليهم حجارة من طين ۝ مسومة عند ربك للمسرفين ۝ (الذاریات/۳۲۔۳۵)

انہوں نے (یعنی فرستادوں نے) کہا ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ان پر مٹی کے پتھر برسائیں جن پر تیرے رب کے ہاں، حد و فراموش لوگوں کے لئے نشان لگائے گئے ہیں۔

(۳) انا ارسلنا عليهم حاصبا (القمر/۳۴)

ہم نے ان پر سنگریزے برسانے والی آندھی بھیجی۔

(۴) فلما جاء جعلنا عاليها سافلها وامطرنا عليها حجارة من سجيل منضود ۝ مسومة عند ربك ط وما هي من الظلمين ببعيد ۝ (ہود/۸۲۔۸۱)

سو جب ہمارا حکم (عذاب) آ گیا۔ ہم نے اُسے تہ و بالا کر دیا۔ اور ہم نے اُس پر سخت پتھر پے در پے برسائے، جو تمہارے رب کے پاس سے نشانی لگائے ہوئے تھے اور وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔

مطلب یہ کہ یہ پتھر ان ظالموں سے کچھ دور نہ تھے۔ وہیں آس پاس موجود تھے۔ بادِ تند نے اٹھایا اور ان کے سروں پر برسا دیا۔

سجیل کو سنگِ گِل (یعنی مٹی کا پتھر) سے معرّب خیال کیا گیا ہے۔ لیکن اس لفظ کا مادہ گِل، عربی زبان میں موجود ہے۔ اور اسکے مشتقات بکثرت عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسلئے سجیل کو

معرّب خیال کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

منضود۔ نضد، سامان کے ایک دوسرے کے اوپر رکھنے پر بولا جاتا ہے۔ (المفردات) اور منضود کے معنی ہیں تتبع بعضہ بعضا (تفسیر ابن جریر) ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، پے در پے برس رہے تھے اور قرآن کریم سے طلح منضود۔ (الواقعہ/۲۹) اور ایسا ہی نضید (ق/۱۰) یعنی تہ بتہ۔ قرآن کریم نے پتھر برسانے کا ذکر کر کے خود بتا دیا کہ عالی کو سافل بنانے سے مراد تہ و بالا کرنا ہے۔

(۵) وامطرنا عليهم مطرا فساء مطر المنذرين (نمل/۵۸)

اور ہم نے ان پر ایک ہولناک مینہ برسایا تو کیا ہی بُرا برسا ہوا ان لوگوں پر جنکو آگاہ کیا جا چکا تھا۔

و امطرنا عليهم مطرا کو انا ارسلنا عليهم حاصبا کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بارش پانی کی نہیں بلکہ پتھروں کی تھی۔ اور یہی اصل عذاب تھا اور اسی کے ذریعے سے وہ زمین تہ و بالا کر دی گئی اور ظاہر ہے کہ پتھروں کی بارش آتش فشاں پہاڑوں سے ہوتی ہے اور پے در پے یعنی مسلسل بھیجنے سے بھی یہی مراد ہے۔

(۶) فاخذتهم الصيحة مشرقين ۝ فجعلنا عاليها سافلها وامطرنا عليهم حجارة من سجيل ۝ (الحجر/۷۴)

سو ایک خطرناک آواز نے انہیں سورج نکلتے ہی آ پکڑا۔ پس ہم نے اُسے تہ و بالا کر دیا اور ہم نے اُن پر سخت پتھر برسائے۔

قومِ لوط پر عذاب کی آیتوں میں درج ذیل الفاظ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

(الف) رجزاً من السماء (عنکبوت/۳۴)

وہ تباہیاں اور بربادیاں جو خارجی حوادث کی رو سے آئیں۔ اگر صرف لفظ رجز آئے تو اس کے معنی عذاب کے نہیں ہوتے بلکہ کمزوری کے ہوتے ہیں۔

(ب) حجارة من طين (الذاریات/۳۳)

تاج العروس کے مطابق الطین، گیلی مٹی کو کہتے ہیں اور المفردات کے مطابق الطین پانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں۔ خواہ اس سے پانی کا اثر زائل ہی کیوں نہ ہو جائے یعنی اگر وہ قدرے خشک ہو جائے تو بھی اُسے طین کہہ دیا جائے گا۔ پس حجارۃ من طین کے معنی ہوں گے گیلی مٹی کے بنے ہوئے پتھر۔

(ج) حاصباً (القمر/۳۴)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاج العروس اور محیط المحیط کے مطابق وہ تیز ہوا (آندھی کا جھکڑ) جو مٹی، غبار اور کنکریاں اُڑائے۔

(د) حجارۃ من سجیل منضود (ہود/۸۲)

سورۂ ذاریات میں حجارۃ من طین کہا گیا ہے۔ جبکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنگ گل متحجر تھی۔

(ہ) وامطرنا علیہم مطرا (نمل/۵۸)

تاج العروس کے مطابق، عذاب کی بارش کے لئے بھی بولتے ہیں۔ امام راغب کے بقول امطر اس بارش کے لئے بولتے ہیں، جو نقصان رساں ہو۔

(و) صیحہ (الحجر/۷۳)

قرآن کریم میں الصیحہ کا لفظ عذاب کے لئے آتا ہے۔ اس آواز کے لئے بھی آتا ہے، جو کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کے وقت آتی ہے۔ سورۂ یٰسین ۲۹/ میں یہ لفظ ایسی تباہی اور بربادی کے لئے آیا ہے، جو یک لخت آجائے کیونکہ ایسے موقع پر چیخ و پکار مچ جاتی ہے۔ اور ویسے بنیادی طور پر پورے زور سے نکالی ہوئی سخت آواز کو کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا مختلف الفاظ سے عذاب الٰہی کی مختلف کیفیات کو سمجھا جا سکتا ہے اور خلاصۂ کیفیات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پتھر برسانے والی تیز آندھی بھیجی، جس میں سخت اور مہیب آواز کی طوفانی بھی شامل تھی۔

البتہ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ کیفیات عذاب کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"غالباً یہ عذاب ایک سخت زلزلے اور آتش فشاں پہاڑ کی شکل میں آیا تھا اور اس زلزلے نے انکی بستیوں کو تلپٹ کیا اور آتش فشاں مادے کے پھٹنے سے ان کے اوپر زور کا پتھراؤ ہوا۔ پکی ہوئی مٹی کے پتھروں سے مراد شاید وہ سخت مٹی ہے، جو آتش فشاں علاقے میں زیر زمین حرارت اور لاوہ سے پتھر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آج تک بحر لوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس انفجار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔"[۹]

امین احسن اصلاحی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے بقول:

قوم لوط پر اس طوفانی ہوا کا عذاب آیا تھا۔ جو صحراؤں سے اُٹھتی ہے اور قافلے کے قافلے اور بستیوں کی بستیاں، جسکی اٹھائی ہوئی ریت اور جھکڑ کے برسائے ہوئے کنکروں اور پتھروں کے نیچے دب کر تہ ہو جاتی ہیں۔ عربی میں اسکو حاصب یعنی پتھر برسانے والی آندھی کہتے ہیں۔"[۱۰]

اور غلام احمد پرویز رقمطراز ہیں:

قوم سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے بھرا پڑا تھا۔ آتش فشاں پہاڑوں

کا انشقاق بڑا ہلاکت انگیز عذاب ہوتا ہے۔ کبھی تو آتش فشاں سیال مادہ (لاوا) کی شکل میں ایک بہتا ہوا جہنم بن کر گرد و پیش کے علاقوں کو دہکتے ہوئے انگاروں کی بھٹی بنا دیتا ہے۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہاڑ کے دہانے سے راکھ اور پتھروں کا مینہ برستا ہے۔ جسکی بوچھاڑ دور دور تک جاتی ہے۔ پمپائی کی تباہی اسی قسم کی "بارش" سے ہوئی تھی اور کہا جاتا ہے کہ ان پتھروں کی زد سینکڑوں میل تک تھی۔ قوم لوط کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی۔ گندھک کی کانوں میں آگ بھڑک اٹھی اور پھر ایسے زلزلے آئے کہ زمین نیچے دھنس گئی اور جھیل کا پانی اوپر آ گیا۔ یہ علاقہ آج بھی بالکل کھنڈر ہے۔ اور بحر میت (Dead Sea) کے پانی میں اس قدر تیزابی مادوں کی آمیزش ہے کہ وہ خود ایک آتش سیال ہے۔[۱۱]

یہ عذاب الٰہی اتنا مہیب، مہلک اور مستطیر تھا کہ جس نے کسی کافر فرد کو زندہ نہ رکھا جبکہ اہل ایمان ہمیشہ کی طرح محفوظ و مامون رہے۔ کیونکہ حضرت لوط نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی تھی کہ

رب نجنی و اھلی مما یعملون. (الشعراء/۱۶۹)

اے میرے پروردگار مجھکو اور میرے متبعین کو، ان کے (یعنی کافروں کے) عمل کے انجام سے بچا لے۔

پس اللہ نے دعائے لوط کی شرف قبولیت بخشا۔ حضرت لوط اور ان کے متبعین کی حفاظت کی صورت قرآن مجید نے یوں بیان فرمائی ہے۔

قالوا یالوط انا رسل ربک لن یصلوا الیک فاسر باھلک بقطع من اللیل ولا یلتفت منکم احد الا امراتک (ہود/۸۱)

انہوں نے کہا اے لوط! ہم تمہارے رب کے فرستادے ہیں۔ وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے تو تم رات ختم ہونے سے ذرا پہلے اپنے متبعین کو لے کر نکل جاؤ۔ مگر تمہاری بیوی اس سے مستثنیٰ ہے۔ اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔

اور اب وہ آیات ملاحظہ کیجئے جن میں آل لوط کی نجات کا ذکر کیا گیا ہے۔

انا لمنجوھم اجمعین ○ الا امراتہ قدرنا انھا لمن الغابرین (الحجر/۵۹-۶۰)

ہم ان سب کو ضرور بچا لیں گے بجز اس کی بیوی کے۔ اس کو ہم نے تاک رکھا ہے۔ وہ بے شک پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی۔

فنجینہ واھلہ اجمعین ○ الا عجوزاً فی الغابرین ○ ثم دمرنا الآخرین ○ (الشعراء/۱۷۰-۱۷۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سو ہم نے اسے اور اسکے متبعین کو نجات دی۔ صرف ایک بڑھیا (حضرت لوط کی بیوی) پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ چھوڑ دی گئی۔ پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا۔

فانجینہ واھلہ الا امراتہ کانت من الغابرین ٥ (الاعراف:۸۳۔ النمل:۵۷۔۵۸)

سو ہم نے اسے اور اس کے اہل کو بچا لیا سوائے اس کی عورت کے۔ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں "اہلہ" کے لفظ پر توجہ ہے۔ امام راغب اصفہانی کے بقول کسی شخص کے اہل میں وہ سب لوگ داخل ہوتے ہیں جنہیں ایک گھر یا ایک نسب یا ایک شہر یا ایک دین جمع کر دے۔ (المفردات)

بلاشبہ یہاں "اھلہ" سے مراد حضرت لوط کے متبع ہی ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کے متبعین ہی بچائے جاتے ہیں۔

ونجینہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبائث الخ (الانبیاء:۷۴)

اور اسے (یعنی لوط کو) اس بستی سے نجات دی جو ناپاک کام کرتی تھی۔

نجینہ بسحر ہ نعمۃ من عندنا (القمر:۳۵)

اسے ہم نے صبح کے وقت بچا لیا خاص اپنے فضل سے۔

دیگر انبیاء کی نافرمان اور گستاخ قوموں پر جس طرح فیصلہ کن عذاب آتے رہے ہیں یہ عذاب بھی اسی قبیل سے تھا۔ جس میں اہل ایمان کو بچا لیا گیا اور اہل کفر و ضلالت کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے عذاب میں کسی بھی کافر کا بچنا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ کافر خواہ پیغمبر کا انتہائی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح طوفان نوح میں حضرت نوح کا بیٹا عذاب الٰہی سے نہ بچ سکا۔ اسی طرح پتھروں کی بارش سے حضرت لوط کی بیوی بھی نہ بچ سکی۔ خدا کا قانون بلاشبہ انتہائی بے لاگ ہوتا ہے۔ اس کے قانون میں وصل و فصل کی بنیاد نسب اور زوجی تعلق نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح ہوتا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ:

۱۔ حضرت لوط قوم سدوم کی طرف مبعوث ہوئے۔

۲۔ حضرت لوط کی قوم کے جس سنگین جرم کو قرآن نے نمایاں کیا ہے وہ ان کی امرد پرستی ہے۔ (الاعراف:۸۰، الشعراء:۱۶۵،۱۶۶، النمل:۵۴،۵۵، عنکبوت:۲۸،۲۹)

۳۔ قوم لوط نے عذاب الٰہی کا مطالبہ حضرت لوط سے خود کیا۔ (عنکبوت:۲۹)

۴۔ یہ قوم عذاب کی مختلف کیفیات سے مرکب عذاب سے ہلاک ہوئی۔ (عنکبوت:۳۴،

© rasailojaraid.com

الذاریات:۳۳،۳۵، القمر:۳۴)

۵۔ حضرت لوط اور ان کے متبعین کی نجات کا تذکرہ مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ (الشعراء:۱۷۰،۱۷۱، الاعراف:۸۳، الانبیاء:۷۴، القمر:۳۵)

قوم شعیب کے عذاب کا بیان

حضرت شعیب علیہ السلام قوم مدین کی طرف مبعوث کیے گئے۔

والیٰ مدین اخاھم شعیبا قال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ (الاعراف:۸۵، ھود:۸۴)

اور مدین کی بستی میں ان کے ہم قوم شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا اے لوگو اللہ کی بندگی و محکومیت اختیار کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

حضرت شعیب، حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے پانچویں پشت میں ہیں، اسلیے ان کا ذکر تاریخی ترتیب میں حضرت لوط کے بعد آیا ہے۔ بائبل میں ہے کہ مدیان، حضرت ابراہیم کے ایک بیٹے کا نام تھا، جو اگی (تیسری) بیوی قطورہ کے بطن سے تھا ۱۲ اسی نام کا ایک شہر بحیرہ قلزم پر ہے۔ جہاں مدیان کی نسل آباد ہوئی قرآن مجید میں ان اقوام کے ساتھ، جو قہر خداوندی کا شکار ہوئیں ان میں اصحاب الایکہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ (ق ۱۲،۱۴) بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ سے مراد اصحاب مدین ہی ہیں، کہیں ان کو اصحاب مدین فرمایا گیا ہے۔ اور کہیں اصحاب الایکہ اور بعض مفسرین نے دونوں کو الگ الگ قومیں سمجھا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ حضرت شعیب قوم مدین کے ساتھ ساتھ اصحاب الایکہ کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے چونکہ یہ علاقہ مدین سے متصل تھا۔ اسلیے آپ کی نبوت کا دائرہ اس قوم کو بھی محیط تھا۔ تاریخی روایات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں بستیاں جڑواں تھیں۔ اور ان میں بسنے والے لوگ بھی ایک ہی زبان بولتے تھے۔ اس لیے قرآن مجید میں اصحاب الایکہ کے تعلق سے بھی حضرت شعیب کا ذکر کیا گیا ہے۔

کذب اصحٰب الایکۃ المرسلین ٥ اذقال لھم شعیب الاتتقون ٥ انی لکم رسول امین ٥ فاتقوا اللہ واطیعون ٥ (الشعرا/۱۷۶،۱۷۹)

اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ جب شعیب نے ان سے کہا کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔ سو اللہ کے قانون کی تابعداری کرو۔ اور میری فرمانبرداری کرو۔

قرآن مجید کے متعلقہ مقامات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین والوں پر جو عذاب آیا۔ وہ رجفہ اور

© rasailojaraid.com

صیحه کی شکل میں تھا۔

فاخذتهم الرجفة فاصبحوا فی دارهم جثمین ہ الذین کذبوا شعیبا کان لم یغنوا فیها۔(الاعراف/۹۱،۹۲)

جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا۔ان کو رجفه نے پکڑا،پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔گویا کہ وہ وہاں بسے ہی نہ تھے۔

(لفظ رجفه کے تعلق سے مزید دیکھئے)(عنکبوت/۳۷)

واخذت الذین ظلموا الصیحة فاصبحوا فی دیارهم جثمین ہ کان لم یغنوا فیها۔(ھود/۹۴،۹۵)

اور جنہوں نے ظلم کیا۔ان کو سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہی رہ گئے،گویا وہ کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے۔

رجفه اور صیحه کا ذکر حضرت صالح کے باب میں قدرے وضاحت سے آچکا ہے۔اسلئے انکے اعادہ سے گریز کر رہا ہوں۔ہمارے نزدیک رجفه اور صیحه کے عذاب کا جو مفہوم قوم صالح کے ساتھ سمجھا گیا ہے۔وہی مفہوم یہاں مراد ہے۔

حضرت شعیب نے اپنی قوم سے جو خطاب کیا تھا۔ان کے الفاظ پر توجہ رہے تو بات بالکل واضح ہو جائیگی

ویقوم لا یجرمنکم شقاقی ان یصیبکم مثل ما اصاب قوم نوح او قوم هود او قوم صالح وما قوم لوط منکم ببعید ہ (ھود/۸۹)

اور اے میری قوم!میری دشمنی تم سے ایسا نہ کرائے کہ تم پر ایسی ہی مصیبت آپڑے جیسی نوح کی قوم یا ھود کی قوم،یا صالح کی قوم پر پڑی،اور لوط کی قوم بھی تم سے دور نہیں۔

تو چونکہ حضرت صالح کی قوم پر صیحہ اور رجفہ کی شکل میں عذاب نمودار ہوا تھا۔اور حضرت شعیب نے اپنے خطاب میں جن چار نبیوں کی قوموں پر عذاب کا ذکر فرمایا تھا۔ان میں حضرت صالح کی قوم بھی شامل تھی۔

نیز زلزلے کے عذاب کے لیے یہ دونوں الفاظ بطور تعبیری اسلوب کے حضرت صالح کی قوم کے لیے پہلے آچکے ہیں۔اسلیے ہمارے نزدیک،حضرت شعیب کی قوم پر کم وبیش وہی عذاب آیا تھا۔جو حضرت صالح کی قوم پر آیا تھا۔(کم وبیش کا لفظ عذاب کی تفصیلی کیفیات کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے)

یہ تو مدین والوں کے عذاب کا بیان تھا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اصحاب الایکہ پر بھی یہی عذاب آیا یا وہ کوئی دوسرا عذاب تھا۔سو قرآن مجید کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اصحاب الایکہ پر جو

عذاب آیا۔وہ اصحاب المدین سے مختلف تھا۔اصحاب الایکہ کے عذاب کو قرآن مجید میں "عذاب یوم الظلة" کہا گیا ہے۔

فکذبوه فاخذهم عذاب یوم الظلة انه کان عذاب یوم عظیم ہ(الشعراء/۱۸۹)

سو انہوں نے جھٹلایا۔پس شعلوں والے دن کے عذاب نے انہیں آپکڑا۔وہ بڑے عذاب کا دن تھا۔

ظُلَّـــه (جمع ظلل) ہر ڈھانپ لینے والی چیز کو کہتے ہیں۔(تاج العروس)امام راغب کے بقول اسکا استعمال ناخوشگوار مواقع کے لیے عام ہے۔جبکہ قوم شعیب کے عذاب کے متعلق آیا ہے "ظلل من النار" آگ کے ان شعلوں کو کہا جاتا ہے،جو چھا جائیں یا ڈھانپ لیں۔

اہل جہنم کے عذاب کے لئے کہا گیا ہے۔

لهم من فوقهم ظلل من النار ومن تحتهم ظلل۔(زمر/۱۶)

ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے شعلے ہوں گے اور ان کے نیچے بھی ایسی ہی شعلے ہوں گے۔

گویا آگ ہی آگ ہوگی اوپر بھی نیچے بھی یعنی چاروں طرف سے محیط۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ دوزخ میں مکان کی کیفیت وہ نہیں جو یہاں ہے۔

آگ کے عذاب کو سمجھنے کے لیے لفظ ایکہ پر توجہ رہے۔ایکہ چونکہ اس بستی یا علاقے کا نام تھا کہ جہاں گھنے جنگلات تھے۔درختوں کی کثرت اور بہتات کے باعث ہی تو اس بستی والوں کو اصحاب الایکہ کہا جاتا تھا۔پیر محمد کرم شاہ الازہری نے الایکہ کی تعریف میں لکھا ہے: الشجر الکثیر الملتف الواحدة ایکه فهی الغیضة.وہ جگہ جہاں گھنے اور گنجان درختوں کا ذخیرہ ہوا سے عربی میں ایکہ کہتے ہیں۔(۱۳)اس لیے ہمارے خیال میں یہ وہ عذاب تھا جو جنگل کی آگ،کے محاورہ کی صحیح معنی میں واقعہ نگاری یا عملی تصویر تھا۔

یاد رہے کہ اصحاب ایکہ نے حضرت شعیب سے خود کہا تھا۔

فاسقط علینا کسفا من السماء۔(الشعراء:۱۸۷)

پس ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا گرادے اگر تو سچا ہے۔

کسف کے لغوی معنی تو ٹکڑے کے ہیں لیکن یہ لفظ کسی ناگہانی تباہی و بربادی کے لیے بھی آتا ہے بلکہ آفت سماوی کے لیے یہ لفظ زیادہ موزوں ہے۔جیسے کسفت الشمس والقمر کے معنی ہیں سورج اور چاند گہن میں آگئے۔معلوم ہوتا ہے کہ الشعراء:۱۸۷ میں کسفا من السماء سے مراد آسمانی بجلی ہے۔جو ان درختوں پر گری۔جہاں اصحاب الایکہ رہتے تھے۔اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پوری بستی کو اپنی لپیٹ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لے لیا۔ امام حاکم کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ کا عذاب نازل فرمایا تھا۔ اس عذاب کو ظلہ کا عذاب کہتے ہیں۔

یہ وہ عذاب تھا جو اصحاب الایکہ نے اپنے پیغمبر سے خود طلب کیا تھا۔ برخلاف مدین والوں کے کہ جن کے لیے حضرت شعیب نے اپنے پروردگار سے خود عذاب مانگا تھا۔

ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق وانت خیر الفاتحین۔ (الاعراف:۸۹)

اے ہمارے پروردگار! ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

عذاب الٰہی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف منکروں، مکذبوں، معاندوں اور دشمنوں پر ہی نازل ہوتا ہے، اہل ایمان اور عمل صالح اختیار کرنے والے لوگ کبھی اس کا شکار نہیں ہوتے۔ چنانچہ دیگر عذابوں کی طرح اصحاب مدین کا یہ عذاب بھی صرف خبیث الفطرت افراد کا مقدر بنا۔

ولما جاء امرنا نجینا شعیبا والذین امنوا معه برحمة منا۔ (هود:۹۵)

اور جب ہمارا حکم (عذاب) آ گیا تو ہم نے شعیب کو اور انہیں جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے بچا لیا۔

اصحاب مدین کے تعلق سے ایک مقام پر جن دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی دو گروہ ہیں۔ ایک اہل ایمان کا اور دوسرا اہل کفر کا۔

کان طائفة منکم آمنوا بالذی ارسلت به وطائفة لم یومنوا (الاعراف/۸۷)

تم میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اس پر ایمان لایا ہے جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا۔

چنانچہ اہل ایمان کا گروہ اس عذاب سے بچا لیا گیا۔ جہاں تک اصحاب الایکہ کا تعلق ہے، لگتا یہ ہے کہ وہ ساری کی ساری بستی جل کر خاکستر ہو گئی۔ اس عذاب کے ساتھ کسی اہل ایمان کے بچ جانے کا ذکر نہیں ملتا۔

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کے الگ الگ ہونے اور دونوں بستیوں کے عذاب میں فرق ہونے کو سید سلیمان ندویؒ نے بایں الفاظ بیان کیا ہے۔

قرآن کی رو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مدین اور ایکہ دو چیزیں ہیں، کیونکہ ان دونوں قوموں کا حضرت شعیب سے سوال و جواب و طرز خطاب اور پھر آخر بربادی اور طریقہ بربادی بالکل

مختلف ہے۔ اس بناء پر کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ۱۵

سید مودودیؒ رقمطراز ہیں:

قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب مدین کے عذاب کی کیفیت اصحاب الایکہ کے عذاب سے مختلف تھی۔۔۔۔۔۔۔ اس لئے دونوں کو ملا کر ایک داستان بنانے کی کوشش کرنا درست نہیں۔ ۱۶

واضح ہو کہ امام قرطبیؒ امام فخر الدین رازیؒ نے بھی اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین دو مختلف قومیں تھیں اور دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ عذاب نازل ہوا۔

حاصل کلام یہ کہ قوم شعیب (اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین) پر ان کی بداعمالیوں اور معاشی بے اعتدالیوں کے باعث جو عذاب خداوندی نازل ہوا یہ وہ عذاب تھا کہ جس کا تعلق قوم کے اعمال قبیحہ سے تھا۔ اگرچہ وہ کسی نیچرل پروسس کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) حضرت شعیب قوم مدین کی طرف مبعوث ہوئے۔ (الاعراف/۸۵۔ ھود/۸۴)

(۲) حضرت شعیب اصحاب الایکہ کی طرف مبعوث ہوئے۔ (الشعراء/۱۷۶۔۱۷۹)

(۳) یہ دونوں الگ الگ مگر جڑواں قومیں یا بستیاں تھیں اور دونوں کی زبانیں بھی ایک تھیں۔

(۴) اصحاب مدین پر جو عذاب آیا وہ رجفہ اور صیحہ کی شکل میں تھا۔ جسے زلزلے سے تعبیر کیا گیا۔ (الاعراف/۹۱۔۹۲۔ ھود/۹۴۔۹۵)

(۵) اصحاب الایکہ پر جو عذاب آیا وہ عذاب یوم الظلّۃ تھا (الشعراء/۱۸۹)

(۶) اصحاب الایکہ نے حضرت شعیب سے عذاب کا مطالبہ کیا تھا (الشعراء/۱۸۷)

(۷) اصحاب مدین کے لئے حضرت شعیب نے اپنے رب سے عذاب خود مانگا تھا۔ (الاعراف/۸۹)

(۸) اصحاب مدین میں سے اہل ایمان عذاب الٰہی سے محفوظ رہے (ھود/۹۵)

(۹) اصحاب الایکہ میں سے کسی کے بچنے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ (الشعراء/۱۸۹)

قوم موسیٰ کے عذاب کا بیان

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیلی سلسلہ انبیاء علیہم السلام میں سے سب سے زیادہ معروف اور مشہور پیغمبر گذرے ہیں۔ آپ کی قوم پر متعدد اقسام کے عذاب آئے۔ جن میں سے بعض عذابوں کی نوعیت ابتلاء کی تھی، جسے عارضی عذاب کہنا چاہیے۔ ان عارضی عذابوں کے بعد ان پر آخری اور فیصلہ کن عذاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی مسلط ہوا۔

ولقد اخذنا اٰل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات لعلھم یذکرون۔ (الاعراف:۱۳۰)

اور البتہ ہم نے فرعون کے لوگوں کو قحط اور پھلوں کی کمی میں پکڑا تا کہ وہ نصیحت قبول کریں۔

سنین سنۃ کی جمع ہے جسکے معنی سال کے ہیں۔ مگر اس کا زیادہ استعمال قحط کے سال پر ہوتا ہے۔ (المفردات)

بالعموم اس وقت جب یہ لفظ اخذ کے ساتھ آتا ہے۔ اخذہ السنۃ کے معنی ہیں وہ خشک سالی میں مبتلا ہو گیا۔ لفظ سنین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قحط سالی کی وبا کئی سالوں پر محیط رہی ہے۔

فارسلنا علیھم الطوفان والجراد والقمل والضفادع والدم اٰیٰت مفصلات فاستکبروا وکانوا قوما مجرمین۔ (الاعراف:۱۳۳)

پس ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈکیں اور خون الگ الگ نشانیاں بھیجیں مگر انہوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم قوم تھے۔

ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ عربی میں قمل جوؤوں کو بھی کہتے ہیں اور چھوٹی مکھیوں کو بھی۔ اگر تورات میں جوؤوں کا ذکر نہ ہوتا تو ہم ترجمہ میں مکھیاں لکھتے۔ کیونکہ انسانی ہلاکت کے لیے یہ زیادہ موثر و قطعی ہیں۔ (۱۷)

ابن فارس نے فرمایا کہ قمل وہ گھن ہے جو گندم کو لگ جاتا ہے۔ زید کہتے ہیں کہ اس سے مراد پسو ہیں۔ (۱۸)

مینڈکوں کے عذاب پر تفسیر ثنائی کے مفسر رقمطراز ہیں:

> اس زمانے میں بھی اس عذاب کی مثال پیدا ہو گئی ہے۔ اخباروں میں یہ خبر گشت کر رہی ہے۔ ایک مضمون نگار لکھتا ہے کہ میں نے ایک موقع پر دو سیاحوں کو دیکھا کہ ان کے لبادوں میں بہت چھوٹے چھوٹے مینڈک لپٹے ہیں۔ مسافر سر سے پاؤں تک بھیگے ہوئے تھے۔ میرے استفسار پر کہا ایسی جگہ سے آ رہے ہیں جہاں سخت طوفان آیا۔ بارش ہوئی اور ساتھ ہی بے شمار مینڈک برسے۔ یہ واقعہ فرانس کے شہر طولون کا ہے۔ مضمون نگار لکھتا ہے کہ میں ان مسافروں سے رخصت ہو کر چند ساعتوں کے بعد ایسے مقام پر پہنچا جہاں مینڈکوں سے زمین ڈھکی ہوئی تھی۔ جا بجا مینڈک گھوڑوں کے سموں کے پاؤں اور گاڑیوں کے پہیوں سے کچلے پڑے تھے۔

(اخبار زمیندار، لاہور بحوالہ پنجاب سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۷ء)

ممکن ہے کہ اس طرح فرعونیوں پر مینڈک پڑے ہوں جن سے وہ تکلیف میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ ٹڈی دل بھی کہیں نہ کہیں آتا رہتا ہے۔ (۱۹)

بعض مفسرین نے خون سے مراد مرض نکسیر لیا ہے۔ یہ تمام نشانات قدرت اکٹھے ظاہر نہیں کیے گئے بلکہ وقفے وقفے سے ظاہر کیے گئے تاکہ لوگوں کو اپنے اعمال پر نظر ثانی کا موقع ملتا رہے۔ قرآنی لفظ مفصلات سے یہی مفہوم ملتا ہے۔ ان نشانوں یا عذابوں کا ذکر بائبل میں بھی قدرے فرق کے ساتھ ملتا ہے۔ (۲۰)

فارسلنا علیھم رجزا من السماء بما کانوا یظلمون۔ (الاعراف:۱۶۲)

پس ہم نے ان پر آسمان سے وبا بھیجی اس لیے کہ وہ ظلم کرتے تھے۔

فانزلنا علی الذین ظلموا رجزا من السماء بما کانوا یفسقون۔ (البقرۃ:۵۹)

پس ہم نے ان کے فسق کے سبب ان ظالموں پر آسمان سے عذاب اتارا۔

رجزا من السماء سے مراد وہ تباہیاں اور بربادیاں ہیں جو بالعموم خارجی حوادث کی رو سے آئیں۔ اور یہ حوادث انسانی اعمال کی دنیا سے جڑے ہوئے ہوں۔ ورنہ انسانوں کے ظلم و فسق کو رجزا من السماء سے منسلک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ولما وقع علیھم الرجز قالوا یا موسیٰ ادع لنا ربک بما عھد عندک لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل۔ فلما کشفنا عنھم الرجز الی اجل ھم بالغوہ اذا ھم ینکثون۔

(الاعراف:۱۳۴، ۱۳۵)

اور جب ان پر عذاب آ پڑتا تو کہتے اے موسیٰ ہمارے رب سے دعا کر جیسا کہ اس نے تجھ سے عہد کیا ہے۔ اگر تو ہم سے عذاب اٹھا دے تو ہم ضرور تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور ضرور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ پس جب ان سے ایک وقت کے لیے جس کو وہ پہنچنے والے تھے عذاب اٹھا دیتے تو وہ فوراً عہد شکنی کرتے۔

یہاں رجز سے مراد وہی نشانات یا عذاب ہیں جو اوپر مذکور ہوئے یا پھر کوئی اور نشان و عذاب ہے۔ مثلاً طاعون اور شدید قسم کی وبا بیماری۔ تورات میں ان عذابوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔

واذ قالت امۃ منھم لم تعظون قوما ن اللہ مھلکھم او معذبھم عذابا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شدیدا قالوا معذرة الی ربکم ولعلهم یتقون. فلما نسوا ما ذکروا به انجینا الذین ینهون عن السوء واخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون. فلما عتوا عن ما نهوا عنه قلنا لهم کونوا قردة خاسئین. (الاعراف: ۱۶۴، ۱۶۶)

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم کیوں اس قوم کو وعظ کرتے ہو جسے اللہ پاک ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے تو انہوں نے کہا تا کہ تمہارے رب کے حضور معذرت پیش کرسکیں اور شاید کہ وہ لوگ بھی خدائی قوانین کو اختیار کرلیں سو جب انہوں نے اسے چھوڑ دیا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان کو بچالیا جو بدی سے روکتے تھے اور جو ظالم تھے ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ سو جب انہوں نے اس سے سرکشی کی جس سے روکے گئے تھے تو ہم نے انہیں کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔

ان آیات میں جس عذاب کا ذکر ہے وہ مسوخ ہونے کا عذاب ہے۔ مسخ صوری تھا یا معنوی؟ اس میں علمائے کرام کے مابین شروع سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ علماء کی اکثریت مسخ صوری کی قائل ہے۔ البتہ مسخ معنوی پر مجاہد تابعی کا قول نقل کیا جاتا ہے (ابن جریر) مفردات میں بھی ایک قول اس معنی میں نقل ہوا ہے۔ قیل بل جعل اخلاقهم کا خلاقها وان لم تکن صورتهم کصورتها۔ (۲۱) مسخ معنوی کے قائلین کے نزدیک ان کے مسخ سے مراد ان کی اخلاقی صفات کی تبدیلی ہے۔ مطلب یہ کہ ان مجرمین کے اندر بندر کی صفات پیدا ہوگئی تھیں۔

ان تمام آیات میں ان عارضی اور محدود عذابوں کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل پر بھیجے گئے تھے۔ امین احسن اصلاحی تقسیم عذاب کے پہلو سے رقمطراز ہیں:

عذاب دو قسموں کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ عذاب ہوتا ہے جس کا مقصد غافلین و منکرین کو جگانا اور جھنجھوڑنا ہوتا ہے کہ وہ داعی کی بات پر کان دھریں اور جس خطرے سے وہ ان کو آگاہ کر رہا ہے اس کے آثار دیکھ کر اگر متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں۔ دوسرا عذاب وہ ہوتا ہے جو کامل اتمام حجت کے بعد رسول کے جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دینے کے لیے نازل ہوتا ہے اور یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے۔ (۲۲)

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیهما السلام نے اپنی قوم کی بار بار بدعہدیوں اور نافرمانیوں بلکہ فرعون و مشرکانہ روش سے تنگ آ کر اللہ تعالیٰ کو پکارا۔

ربنا اطمس علی اموالهم واشدد علی قلوبهم فلا یؤمنوا حتی یروا

العذاب الالیم. (یونس: ۸۸)

اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو برباد کردے اور ان کے دلوں پر حملہ کردے سو وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھیں۔

شد علیه کے معنی ہیں حمل علیه یعنی اس پر حملہ کیا (اقرب) اکثر مترجموں نے اس کے معنی دل کو سخت کرنے کے کیے ہیں۔ پتہ نہیں اس معنی کی کیا سند ہے؟ عربی لغات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حمل کا صلہ جب علی آئے تو اس کے معنی صرف حملہ کرنے کے ہوتے ہیں۔

ان دونوں پیغمبروں کی دعا کو قبولیت کی سند عطا ہوئی۔ (یونس: ۸۹) اور اس قوم پر بالآخر عذاب اتار دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتبعهم فرعون وجنوده بغیا وعدوا حتی اذا ادرکه الغرق قال آمنت انه لا اله الا الذی آمنت به بنو اسرائیل وانا من المسلمین. (یونس: ۹۰)

ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے گزارا اور فرعون اور اس کا لشکر ظلم و تجاوز کرتے ہوئے ان کے پیچھے گیا، جب وہ غرقاب ہونے لگا تو اس نے کہا کہ میں ایمان لایا کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں۔ اور میں مسلمین میں سے ہوں۔ نیز فرمایا:

فانتقمنا منهم فاغرقناهم فی الیم بانهم کذبوا بآیاتنا وکانوا عنها غافلین. ودمرنا ما کان یصنع فرعون وقومه وما کانوا یعرشون. (الاعراف: ۱۳۶، ۱۳۷)

پس ہم نے ان پر سزا بھیجی اور ان کو دریا میں غرق کر دیا۔ اس لیے کہ وہ ہماری باتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے لاپرواہ تھے۔ ہم نے وہ سب تباہ کر دیا جو (محلات) فرعون اور اس کی قوم نے بنائے تھے اور جو باغات انہوں نے تیار کیے تھے۔

امام قرطبی نے یعرشون سے مراد محلات کی تعمیر کو لیا ہے لیکن اس کے دوسرے معنی فرعون کے لگائے ہوئے باغ اور چمن بھی ہو سکتے ہیں۔ الغرض منکرین موسیٰ کا انجام غرقابی سے ہوا۔ اور اہل ایمان کو خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے نجات عطا فرمائی۔

واوحینا الی موسیٰ ان اسر بعبادی انکم متبعون. (الشعراء: ۵۲)

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو (مصر سے) لے جاؤ کیونکہ تمہارا پیچھا کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے گا۔

وانجينا موسىٰ ومن معه اجمعين. ثم اغرقنا الاخرين۔ (الشعراء: ۶۵، ۶۶)

اور ہم نے موسیٰ کو اور جو اس کے ساتھ تھے ان سب کو نجات دی پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔

فاسر بعبادی ليلا انكم متبعون. واترك البحر رهوا انهم جند مغرقون.
(الدخان: ۲۳، ۲۴)

تم میرے بندوں کو رات کے وقت لے جاؤ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔ اور دریا کو ساکن چھوڑ دو، یہ ایک لشکر ہے جسکے سب لوگ غرق کیے جائیں گے۔

اس تفصیل میں عذابِ الٰہی کا استدلالی پہلو یہ ہے کہ فرعون اور اس کی آل کی غرقابی کا واقعہ کوئی امر اتفاقی نہ تھا۔ اور اسی طرح اہلِ ایمان کی نجات میں موسیٰ کی کسی ذاتی تدبیر کا بھی کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ یہ سب امر الٰہی سے واقع ہوا۔ سمندر نے حضرت موسیٰ کو اعجازی رنگ میں راستہ دیا اور آلِ فرعون اسی راستے پر غرق ہوئے۔

چونکہ یہ بھی ایک فیصلہ کن عذاب تھا اس لیے اپنے نتیجے کے اعتبار سے پچھلی قوموں کے عذاب جیسا تھا۔ یعنی اہلِ کفر ختم کر دیے گئے اور اہلِ ایمان بچا لیے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے واقعات کسی نیچرل پروسیس کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ گو وہ بظاہر نیچرل پروسیس کے تحت ہی واقع ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا کچھ ضروری بھی نہیں بلکہ یہ خرقِ عادت کے تحت بھی واقع ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ موسیٰ اور فرعون کے واقعہ میں بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ واقعات فقط نیچر کے تحت واقع ہوتے تو نیچر چونکہ اندھی ہوتی ہے، وہ اپنے ظہور میں افراد کے مابین تمیز نہیں کر سکتی کہ بعض اخلاقی عوامل کے تحت لوگوں کو بچا لے اور بعض کو ختم کر دے۔ لیکن یہ تمیز صرف خدا ہی کر سکتا ہے اور وہی کرتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بقول:

منکر و سرکش جماعتوں کی ہلاکت کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں وہ سب اسی نوعیت کے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے قدرتی حوادث کا ظہور تھا مثلاً زلزلہ، طوفان، سیلاب، آتش فشانی۔ پھر انہیں مقررہ عذاب کیوں کہا گیا؟ اس لیے کہ گو ان کا ظہور قدرت کی عادی و جاری صورتوں میں ہی ہوا تھا لیکن اس لیے ہوا تھا کہ انکار و سرکشی کے نتائج لوگوں کے سامنے آ جائیں اور پیغمبروں نے ان کے ظہور کی پہلے خبر دے دی تھی۔ ضروری نہیں کہ ہر زلزلہ، کسی گروہ کے لیے عذاب ہو لیکن ہر وہ زلزلہ عذاب تھا جس کی کسی پیغمبر نے اتمامِ حجت کے بعد خبر دی تھی۔ اور جسے مشیتِ الٰہی نے اس معاملے سے وابستہ کر دیا تھا۔

خدا نے فطرت کے تمام مظاہر کے لیے ایک خاص بھیس مقرر کر دیا ہے وہ جب بھی آئے گی اس کا بھیس بدل نہیں سکتا۔ لیکن اس کے ظہور کے مقاصد ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے اور حقیقت حال انسانی علم کی دسترس سے باہر ہے۔ (۲۳)

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ:

۱۔ حضرت موسیٰ کی قوم پر دو طرح کے عذاب آئے۔ طرح اول سے وہ عذاب مراد ہیں جو عارضی اور محدود نوعیت کے تھے، جیسے قحط کا عذاب، پیداوار میں کمی کا عذاب، طوفان کا عذاب، ٹڈیوں کا عذاب، جوؤں، پسوؤں یا پھر مکھیوں کا عذاب، مینڈکوں کا عذاب اور خون کا عذاب وغیرہ۔ (الاعراف: ۱۳۰، ۱۳۳)

۲۔ مسخ صوری یا مسخ معنوی کا عذاب بھی آیا۔ (الاعراف: ۱۶۳، ۱۶۶)

۳۔ طرح دوم سے وہ عذاب مراد ہے جو غرقابی کی شکل میں ظاہر ہوا، اس عذاب میں فرعون مع اپنے لشکر کے غرق ہو گیا۔ (الاعراف: ۱۳۶)

۴۔ حضرت موسیٰ اللہ کے حکم سے راتوں رات اپنے متبعین کو لے کر مصر سے نکلے تھے۔
(الشعراء: ۵۲، الدخان: ۲۳)

۵۔ موسیٰ اور ان کے تمام متبعین کو بچا لیا گیا تھا۔ (الشعراء: ۶۵-۶۶)

گزشتہ صفحات میں ہم نے چھ انبیائے کرام کے حوالے سے قرآن مجید کا خصوصی مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض کی امتوں پر ان کی تکذیب، عناد، معصیت، استہزاء اور گستاخی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ جو کبھی طوفان کی شکل میں تو کبھی کنکروں، سنگ ریزوں اور پتھروں کی بارش کی شکل میں، کبھی زلزلے اور دھماکے کی شکل میں تو کبھی تند و تیز ٹھنڈی ہواؤں کی شکل میں، کبھی آگ کی شکل میں تو کبھی غرقابی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

مگر ان تمام استیصالی عذابوں میں ایک چیز مشترک رہی اور وہ یہ کہ تمام کے تمام عذاب انبیائے کرام کی موجودگی میں آئے۔ ان میں بعض تو وہ تھے، جو نبیوں کی دعاؤں کے نتیجے میں آئے (نبیوں کی دعاؤں کے ساتھ لفظ بد کی اضافت ہمارے نزدیک صحیح نہیں، انکی دعائیں کبھی بد نہیں ہوتیں) بعض وہ تھے، جو منکروں کی خواہشوں (Demand) کے نتیجے میں آئے۔ پھر ان عذابوں کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ پیشگی اطلاعوں بلکہ انتباہوں (warnings) کے بعد ہی آئے تا کہ حق و باطل کی کسوٹی بن سکیں۔

اس لیے ہمارے نزدیک پچھلے تمام عذاب، معجزات کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر یہ معجزات نہ ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تے محض طبیعی حادثات ہوتے تو قرآن مجید انہیں اعمال انسانی کا نتیجہ ہرگز قرار نہ دیتا۔ معجزہ ہونے کی سبب ان حوادث کا تعلق اور رشتہ، چونکہ اخلاقی عوامل سے جڑا ہوا تھا، اسلئے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ شاید ہر ایسا فطری حادثہ یا سماوی وارضی سانحہ، انسانی اعمال کے نتیجے میں وجود پذیر ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ ہمیں قدرت کا کوئی مستقل اصول دکھائی دیتا ہے۔

طبیعی حوادث کا سررشتہ ہر حال میں اگر اخلاقی عوامل سے جڑا ہوتا تو (مثال کے طور پر) قوم لوط، جس سنگین عمل کی پاداش میں ہلاک ہوئی تھی۔ برطانیہ اور ان امریکی ریاستوں کو بھی ہلاک ہو جانا چاہیے تھا جنہوں نے اپنے لوگوں کے لیے اسی فعل ملعون کو قانونی جواز مہیا کیا ہے، اور اسی بدفطرتی کو قومی تہذیب کی حیثیت سے اپنایا ہے جو قوم لوط نے اپنائی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ سدوم کے رہنے والے اگر اپنے زمانے میں یہ فعل بد انجام دیں تو ان پر آسمان سے پتھر برسیں اور ترقی زمانہ برطانیہ اور بعض امریکی ریاستوں میں اسے قانونی سند جواز فراہم کی جائے تو وہ کسی ایسی بارش کی زد میں نہ آئیں۔ اس فرق وامتیاز سے معلوم ہوا کہ فطری حوادث کا تعلق، انسانی اعمال سے بطور "اصول" کے نہیں ہوتا بلکہ بطور معجزہ کے ہوتا ہے۔

اور ویسے بھی یہ بات قرآن مجید میں بڑی وضاحت کے ساتھ آ گئی ہے کہ حضور کی امت تو رہی ایک طرف، آپ کے بدترین دشمنوں پر بھی فطری حوادث کی شکل میں ایسا کوئی عذاب کبھی نہیں آئے گا۔ جو پچھلی امتوں پر آیا اس دعوی کی دلیل یہ ہے کہ جب قریش مکہ نے پیغمبر اسلام سے عذاب کا مطالبہ کیا تھا۔

او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفاً۔ (بنی اسرائیل۔۹۲)

یا تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرا دے، جیسا کہ تیرا گمان ہے۔ تو اس کے جواب میں پیغمبر سے کہلوایا گیا۔

قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا ۔ (بنی اسرائیل۔۹۳)

آپ کہہ دیجئے میرا پروردگار ہر کمزوری سے پاک ہے۔ میں رسول بشر کے سوا اور کیا ہوں؟

مطلب یہ کہ اے لوگو! جس طرح کے عذاب کی تم مجھ سے توقع کرتے ہو، اب اس قسم کا عذاب واقع ہونے والا نہیں۔

اور سورہ انفال میں کفار مکہ کا مطالبہ عذاب، خود ان الفاظ آیا ہے۔

واذ قالوا اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم۔ (الانفال۔۳۲)

اور جب انہوں نے کہا اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے (تو عدم تسلیم کی پاداش میں) تو

ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر یا کوئی اور دردناک عذاب لے آ۔

کفار مکہ کی اجتماعی خودکشی کی یہ پکار بھی رد کر دی گئی۔ باری تعالیٰ نے جواب دیا۔

وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم وما کان اللہ معذبھم وھم یستغفرون (الانفال۔۳۳)

اللہ ایسا نہیں کرے گا کہ انہیں عذاب دے بایں حال کہ آپ ان میں موجود ہوں اور نہ اللہ انہیں عذاب دینے والا ہے در یں حال کہ وہ مغفرت کے طالب ہوں۔

اس جواب میں خارق عادت عذاب کے دو موانع موجود ہیں (۱) مکہ میں ذات پیغمبر کی موجودگی (۲) مکہ میں مستغفرین کی موجودگی۔

مانع اول یعنی ذات پیغمبر کی موجودگی کے مسئلے نے جملہ انبیاء ورسل میں، حضور اکرم ﷺ کیلئے ایک ایسا اختصاص وانفراد پیدا کر دیا ہے کہ جس میں کوئی دوسرا پیغمبر ہمیں آپ کا شریک وسہیم نظر نہیں آتا۔ اس اختصاص کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ تاہم ایک سبب ہمیں آپ کا عالمی اور آخری پیغمبر ہونا معلوم ہوتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں آپ نے ملاحظہ کیا کہ تمام عذاب نبیوں کی موجودگی میں آئے، اس قاعدہ سے ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ آپ کے مخالفین ومعاندین پر بھی آپ کی موجودگی میں عذاب آ جاتا، جبکہ وہ خود چاہ بھی رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان پر ایسا کوئی عذاب نہ آیا بلکہ عذاب نہ آنے کی توجیہ خود آپ کی موجودگی سے کی گئی۔

اگر موجودگی سے مراد آپ کا مکہ میں رہنا بسنا تھا تو ہجرت مدینہ کے بعد کیا عذر مانع تھا؟ ہجرت مدینہ کے بعد آپ کے دشمنوں کو ایسے کسی عذاب سے کیوں نہ تباہ وبرباد کر دیا گیا؟ جس کے وہ خود طالب بھی تھے اور مستحق بھی۔ مگر آپ نے دیکھا کہ ان پر ایسا کوئی عذاب نہ آیا۔ اسلئے کہ آپ کی دعوت صرف مکہ والوں کے لیے نہ تھی کہ نہ ماننے کی صورت میں اتمام حجت کے بعد انہیں یک لخت ختم کر دیا جاتا۔ اور اہل ایمان کو بچا لیا جاتا۔

یہاں عالمی وآخری پیغمبر کی دعوت اور زمان ومکان کی محدود اکائیوں کی دعوت میں، جو جوہری فرق ہے۔ وہ بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

مکہ میں مستغفرین کی موجودگی کا مسئلہ بھی خصوصیت کا حامل ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کفار مکہ اپنے کفر وشرک، گستاخی واستہزاء کے باوجود، اللہ تعالیٰ سے استغفار کا تعلق ضرور رکھتے تھے اور طواف کعبہ کے وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللھم غفرانک ،غفرانک کے الفاظ ان کی زبانوں پر ہوتے تھے۔ مگر تعذیم عذاب میں یہ سبب درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ کافروں کی نہ عبادت مقبول ہے اور نہ استغفار۔

وقد منا الیٰ ما عملو من عمل فجعلناہ ھباء منثورا۔ (الفرقان ۲۳)

اور انہوں نے جو بھی (نیک) کام کیئے، ہم انکی طرف قصد فرمائیں گے۔ پھر ہم انہیں بکھرے ہوئے باریک ذرے بنادیں گے۔

دوسرے یہ کہ جب کفار، خود اپنے منہ سے عذاب مانگ رہے ہوں تو ان کے استغفار کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیئے کہ جس دلیل سے ان کے استغفار سے عذاب الٰہی رک سکتا ہے تو کیا اس دلیل سے عذاب آخرت نہیں رک سکتا؟ آخر ایک ہی طرح کے مقدمے میں دو طرح کے فیصلے کیوں؟

البتہ ھم یستغفرون سے مراد اگر ان مومنین کو لیا جائے جو بعض مجبوریوں کی بناء پر ہجرت نہ کر سکے تھے تو بات واضح ہو جاتی۔ اس تفسیر میں ھم کی ضمیر، کفار مکہ کی طرف نہیں بلکہ مومنین مکہ کی طرف لوٹے گی۔ جن کے باعث اللہ نے کوئی آسمانی عذاب نہیں اتارا۔

واضح رہے کہ معذبھم کی ضمیر بہرحال کفار مکہ کی طرف ہی راجع ہوگی۔ بحیثیت مجموعی یوں سمجھئے کہ ھم کی دونوں ضمیریں، اہل مکہ کی طرف راجع ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے ھم سے مراد کفار مکہ اور دوسرے ھم سے مراد مومنین مکہ ہیں۔

اس مفہوم کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

لو تزیلو العذبنا الذین کفروا منھم عذاباً الیماہ (الفتح ۲۵)

اگر وہ (یعنی اہل ایمان) وہاں سے نکل جاتے تو ان (اہل مکہ) میں سے جو کافر تھے، ہم انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرتے۔

یہ آیت، صلح حدیبیہ کے تعلق سے آئی ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان جنگ نہ ہونے دینے کو پروردگار عالم نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اور اسکی کچھ تکوینی اور غیر تکوینی وجوہات بھی بیان کی ہیں، لیکن آیت کے آخری فقرے میں فرمایا ہے کہ مومنوں اور کافروں کا ایک ہی جگہ رہائش پذیر ہونا بھی، کفار مکہ کے بچاؤ کا موجب بن گیا تھا۔ اگر مومنوں کی معاشرت و سکونت ان سے بالکل الگ تھلگ ہوتی تو کفار یقیناً ہلاک کر دیئے جاتے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ہلاکت کسی جنگ کے نتیجے میں ہی واقع ہوتی۔ زیر بحث آیت (الفتح ۲۵) کے تعلق سے سکونت باہمی کا استدلالی پہلو یہ ہے کہ جس طرح وہ عذاب دنیو

ی (یعنی کفار کے قتل) کی راہ میں مزاحم و مانع ہوا ہے۔ بعینہٖ "ھم یستغفرون" (الانفال ۳۳) کا استدلالی پہلو، عذاب استیصال (فیصلہ کن عذاب) کی راہ میں ممانعت کے مضمون پر صراحت کے ساتھ متضمن ہوا ہے۔

واضح رہے کہ انفال کی آیت نمبر ۳۲۔۳۳ میں جس عذاب کا ذکر آیا ہے۔ وہ اس قبیل کے عذاب ہیں جو دیگر امتوں اور قوموں پر آئے۔ یعنی خرق عادت عذاب۔ یہاں اسی کی نفی کی گئی ہے تاہم آیت نمبر ۳۴ میں جس عذاب کا ذکر آیا ہے۔ وہ کفار کی مغلوبیت کا عذاب ہے۔ جو ان پر مسلط ہوا۔ اس طرح کے عذابوں کا ایک الگ قانون ہے۔ جسکا یہاں موقع نہیں البتہ اس پر بعد میں الگ عنوان سے مفصل گفتگو کی جا سکتی ہے۔

خلاصہ تحقیق یہ ہے کہ:

اب طبیعی حوادث کا سر رشتہ، انسانی اخلاقیات و مذھبیات سے جوڑنا بالکل مہمل ہے تاہم یہ سماوی و ارضی حادثات، انسانوں کی اخلاقیات میں اہم کردار ضرور ادا کرتے ہیں۔ بایں سبب ان حوادث کو قدرت کی طرف سے سلسلہ انتباہات کا عنوان مسلسل سمجھا جائے۔ اور اپنے جملہ اعمال کو پیغمبر کی لاتی ہوتی ہدایات کے تابع کیا جائے کہ اس میں سب کی کامیابی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) جوئے نور، ص ۳۰، غلام احمد پرویز، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵۔بی گلبرگ ۲، لاہور، پانچواں ایڈیشن، سن ۱۹۹۴ء

(۲) مجموعہ تفاسیر فراہی، ص ۱۳۲، حمید الدین فراہی، اردو ترجمہ امین احسن اصلاحی، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور (رجسٹرڈ) ۱۲، افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور، سن ۱۹۷۳ء

(۳) ابوتمام حبیب بن اوس الطائی، دیوان حماسہ مترجم ص ۵۱۱، مکتبہ اشتقلیہ لاہور ۱۹۶۵ء

(۴) انگریزی ترجمہ شائع کردہ دار الثقافۃ الاسلامیہ، پاکستان ۲۰۔بے ۵۰۴، ناظم آباد، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں

(۵) ارض القرآن، جلد اول، ص ۱۵۸، دار الاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی اشاعت اول ۱۹۷۵ء۔

(۶) تفسیر ماجدی، سورہ ھود، حاشیہ نمبر ۹۹، تاج کمپنی لمیٹیڈ، لاہور سنہ اشاعت درج نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۷) تدبر قرآن، جلد چہارم، ص ۱۵۹۔ فاران فاؤنڈیشن ۱۳۲، فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور، سن ۱۹۸۸ء

(۸) تدبر قرآن، جلد ہفتم، ص ۶۱۰ (سورہ ذاریات تفسیر زیر آیت ۳۳۔۳۴) بقیہ تفصلات ایضاً

(۹) تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۳۵۹۔ (سورہ ھود۔ حاشیہ نمبر ۹۱) ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور طبع نہم، سن ۱۹۷۵ء

(۱۰) تدبر قرآن، جلد سوم، ص ۳۰۹۔ فاران فاؤنڈیشن ۱۳۲، فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور سن ۱۹۸۸ء

(۱۱) جوئے نور، ص ۱۹۵، ۱۹۶۔

(۱۲) بائبل، کتاب پیدائش، باب ۲۵، آیت نمبر ۱۔

(۱۳) ضیاء القرآن، جلد سوم، ص ۳۱۳۔ ضیاء القرآن، پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور، سن ۱۳۹۹ھ

(۱۴) المستدرک جلد دوم ص ۵۶۹۔ کتاب التاریخ دار المعرفہ بیروت لبنان، سنہ اشاعت درج نہیں۔

(۱۵) ارض القرآن، جلد دوم، ص ۲۶۶، دار الاشاعت کراچی ۱۹۷۵ء۔

(۱۶) تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۵۳۴، (سورہ الشعراء۔ حاشیہ نمبر ۱۱۷) مکتبہ تعمیر انسانیت، اندرون موچی دروازہ، لاہور۔ طبع ہفتم ۔ سن ۱۹۷۴ء

(۱۷) ترجمان القرآن، جلد دوم، ص ۷۲، (حاشیہ زیر آیت ۱۳۲، الاعراف) شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ لمیٹڈ، پبلشرز، (لاہور حیدر آباد، کراچی) ادبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں۔

(۱۸) ضیاء القرآن، جلد سوم، ص ۷۶، پیر محمد کرم شاہ الازہری، مکمل حوالہ اوپر مذکور ہوا۔

(۱۹) تفسیر ثنائی۔ جلد اول (حصہ ۳) جلد ۳ ص ۱۳۷، ثناء اللہ امرتسری، میر محمد کتب خانہ آرام باغ، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں۔

(۲۰) کتاب مقدس، کتاب خروج، باب ۷، ۸، ۹ کی مختلف آیات دیکھیے۔

(۲۱) المفردات فی غریب القرآن، کتاب القاف، ص ۴۰۰، نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں۔

(۲۲) تدبر قرآن، جلد چہارم، ص ۱۳۱، (تفسیر زیر آیت ۳۹، سورۃ ھود) مکمل حوالہ اوپر مذکور ہوا۔

(۲۳) ترجمان القرآن، جلد دوم، ص ۶۶، سورۃ الاعراف کا حاشیہ نمبر ۲۱، مکمل حوالہ اوپر مذکور ہوا۔

(۲۴) انگلستان میں اسے سن ۱۹۶۷ء میں قانوناً جائز قرار دیا گیا۔

☆☆

قرآن اور تمثیلات

علامہ شاہ محمد جعفر ندوی پھلواریؒ

کسی کو بات سمجھانے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک ہے عقلی استدلال۔ دوسرے جذباتی اپیل۔ تیسرے روحانی تاثیر۔ چوتھے تشبیہ و تمثیل اور پانچویں مادی طاقت کا استعمال۔ جب ہم اقلیدس کی شکل اثباتی کسی کو سمجھاتے ہیں تو وہاں صرف عقلی استدلال سے کام لیتے ہیں۔ وہاں نہ جذبات کو ابھارتے ہیں نہ روحانی زور لگاتے ہیں۔ نہ مثالیں دیتے ہیں نہ مادی طاقت کو حرکت میں لاتے ہیں۔ اسی طرح اولاد کی محبت کا فلسفہ سمجھانے کے لیے صرف جذبات کو چھیڑ دینا کافی ہوتا ہے۔ وہاں نہ عقلی استدلال کا کام ہے، نہ روحانی تاثیر کا، نہ تشبیہات کا اور نہ طاقت کا۔ یونہی بعض اوقات صرف روحانی تاثیر وہ کام کر جاتی ہے جو کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی والدہ کی زبانی شان رسالت میں گستاخانہ کلمات سن کر روتے ہوئے آتے ہیں۔ حضور ﷺ صرف اتنا فرماتے ہیں۔ اللھم اھدام ابی ھریرہ۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بادل ناخواستہ گھر واپس آتے ہیں تو والدہ کلمہ شہادت ادا کر رہی ہوتی ہیں۔ یہاں نہ عقل و فلسفہ تھا نہ تمثیلات، نہ جذباتی اپیل، اور نہ مادی طاقت کا استعمال۔

اس وقت ان تمام طریقوں سے بحث کرنا مقصود نہیں۔ یہاں صرف ایک ہی چیز پر گفتگو کرنی ہے اور وہ ہے تشبیہات و تمثیلات سے سمجھانا۔ یوں تو تمام طریقہائے تفہیم اپنی اپنی جگہ کارگر اور سود مند ہیں اور کافی ہیں لیکن تمثیلاتی طریقہ اپنے اندر ایک عجیب تاثیر رکھتا ہے۔ اس سے تین فائدے ہوتے ہیں۔

تمثیل کے فوائد

۱۔ اگر کوئی اور طریقہ پوری طرح کارگر نہ ہو تو صرف تشبیہات و تمثیلات سے بات پوری طرح سمجھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں آجاتی ہے۔

۲۔ اگر دوسرے طریقوں سے سمجھانے کے بعد بات سمجھ میں آ گئی ہو۔ لیکن پوری طرح دماغ اسے گرفت نہ کر سکا ہو۔ یا ابھی کچھ شکوک وشبہات باقی رہ گئے ہوں اور پوری تسکین نہ ہو سکی ہو تو تمثیلات سے یہ خلا پر ہو جاتا ہے۔ اور تشبیہات اس کسر کو پورا کر دیتی ہیں۔

۳۔ اگر بات پوری طرح سمجھ میں آ گئی ہو تو تمثیلات سے مزید وضاحت اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بات دل کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے۔

غرض تمثیلات کسی حالت میں بے فائدہ نہیں ہوتیں۔ یہ صحیح ہے کہ منطقی حیثیت سے مثال لنگڑی ہوتی ہے اور چار پاؤں سے نہیں چلا کرتی اور بقول عارف رومی پائے استدلال۔ چوبیں اور بے تمکیں ہوتا ہے لیکن تشبیہ۔ اپنی تاثیر کے لحاظ سے بعض اوقات تمام طریقہ ہائے تفہیم کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ بلا شبہ تشبیہ و تمثیل کا وہ درجہ نہیں جو منطقی استدلال کا ہوتا ہے لیکن تفہیم کا مقصد عموماً اس کے بغیر تشنہ رہ جاتا ہے۔

تمثیل سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو بات عقلی و منطقی استدلال سے بڑی دیر میں یا بڑی مشکلوں سے سمجھ میں آتی ہے وہ تمثیل کے ذریعے بہت جلد آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ بے شمار انسان دنیا میں ایسے ہیں جن کے دماغوں کی ساخت دوسرے طریقہ ہائے تفہیم کو جلدی قبول نہیں کرتی مگر مثالوں کو فوراً قبول کر لیتی ہے۔

تمثیل کی ضرورت

یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر پیغمبر، ہر حکیم، ہر عاقل، ہر دانا، ہر خطیب، ہر مصنف اور ہر معلم کو تشبیہات اور تمثیلات سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ انہوں نے صرف عقلی استدلال پر اکتفا نہیں کر لیا۔ صرف جذبات کو ابھار کر نہیں چھوڑ دیا۔ محض طاقت کو حرکت میں لا کر الگ نہیں ہو گئے۔ اور فقط روحانی تاثیرات پر قناعت نہیں کی۔ وہ ہر ایک طریقے کو کام میں لاتے رہے۔ مگر تمثیلات و تشبیہات سے کسی کو مفر نہ ہو سکا۔ انہوں نے یہ تمام طریقہ ہائے تفہیم اس لیے اختیار کیے کہ جو دماغ جس طریقے سے مناسبت رکھتا ہو گا وہ اسی راستے سے آئے گا اور یہ تمثیلات اس کو اسی راستے سے ہدایت کی منزل تک آنے میں مدد دیں گی۔

انبیاء علیہم السلام میں سیدنا مسیح علیہ السلام تمثیلات کے بادشاہ ہیں اور ایسی ایسی تمثیلیں دیتے ہیں کہ بڑے سے بڑا عقلی استدلال بھی وہاں پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ حکماء وصوفیاء میں عقلی استدلال کے ساتھ تشبیہات کا امام شاید رومی سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ ان سب سے قطع نظر کر کے اگر آپ قرآن پاک اور احادیث نبوی پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو بے شمار ایسی تمثیلات وتشبیہات ملیں گی جن سے زیادہ چسپاں کوئی مثال، اور جن سے زیادہ موثر کوئی اور چیز نہیں مل سکتی۔ پورے

قرآن اور تمام احادیث کی ساری مثالوں کو پیش کرنا مقصود نہیں اور نہ یہاں اس کا موقع ہے۔ ہم دونوں میں سے ہر ایک کی تھوڑی امثلہ یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جن سے الٰہی تمثیلات اور نبوی تشبیہات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ اور پھر اس سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ہر صاحب علم نے تشبیہات کے ذریعے کیوں بہت سے مسائل سمجھائے اور سکھائے ہیں۔

قرآنی نظریہ تمثیل

قرآن کے پیش نظر صرف مقاصد تمثیلات ہی نہیں بلکہ دو ضروری اجزائے تمثیلات ہیں اس لیے قرآنی تمثیلات سننے سے پہلے یہ دونوں باتیں بھی سن لینی چاہییں۔ اول تو قرآن کا نظریہ تمثیل ہے جس میں وہ بیان فرماتا ہے:-

ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃ فما فوقھا فاما الذین امنوا فیعلمون انہ الحق من ربھم واما الذین کفروا فیقولون ما ذا اراد اللہ بھذا مثلاً ...

اللہ تعالیٰ کو مچھر یا اس سے بھی کمتر چیز کی مثال پیش کرنے میں کوئی حجاب نہیں آتا۔ ایمان والے لوگ تو ایسی مثال سن کر یقین کر لیتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ لیکن اہل کفر یہ کہتے ہیں کہ اس سے خدا تعالیٰ کا مقصود کیا ہے؟

یہاں یہ چیز نوٹ کر لیجیے کہ قرآن میں کہیں بھی مچھر کی کوئی تمثیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ مکھی مکس شہد اور مکڑی کا تو ذکر ہے لیکن مچھر کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ لیکن انہی چیزوں کے ذکر پر اہل کفر یہ طنز کرتے تھے کہ یہ کیا خدا کا کلام ہے۔ جس میں مکھی مچھر کا ذکر ہوتا ہے؟ اسی کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ مچھر تو الگ رہا اگر اس سے بھی کوئی حقیر چیز ہو تو مثال میں اسے پیش کرنے سے اللہ کو شرم نہیں آتی۔ مطلب یہ ہے کہ مثال میں گھٹیا سے گھٹیا چیز بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ دیکھنے کی چیز "ممثل لہٗ" (جس چیز سے تشبیہ دی جائے) نہیں بلکہ "وجہ تشبیہ" کو دیکھنا چاہیے کہ وہ پوری طرح چسپاں ہوتی ہے یا نہیں۔

تمثیل کے اجزائے سہ گانہ

تمثیل کے تین ضروری اجزاء ہوتے ہیں۔ مثال (ممثل) ممثل لہٗ، اور وجہ تمثیل مثلاً "چاند جیسا چہرہ" اس میں "چہرہ" مثال ہے۔ "چاند" ممثل لہٗ اور حسن وجمال وجہ تمثیل۔ مثال میں ایک اور چیز کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خوبی ہو یا زشتی ممثل لہٗ کو مثال سے برتر ہونا چاہیے۔ خوبی کا ذکر ہو تو خوبی میں اور زشتی کی تمثیل ہو تو زشتی میں۔ لیکن اگر ایسا ممثل لہٗ موجود ہی نہ ہو جو وجہ تمثیل میں مثال سے برتر ہو تو مساوی یا کم تر ممثل لہٗ سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں دونوں نظیریں موجود ہیں۔

© rasailojaraid.com